اختری بیگم

مصنفہ

محترمہ ظفر جہاں بیگم صاحبہ

سنہ ۱۹۳۲ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپکر دا[illegible] لاہور سے شائع ہوا۔

بار اول

قیمت ۱۰ ار

فہرست مضامین

بہت عرصہ ہوا۔ ایک کتاب "عقیلہ بیگم کی کہانی" نظر سے گزری تھی۔ جس میں یہ دکھایا گیا تھا۔ کہ ایک عورت نے اپنی عقل اور سلیقہ کی بدولت ایک لکڑہارے کو ایک زبردست جوہری بنا دیا۔ اس کو پڑھ کر مجھے اس قصّہ کے کہنے کا خیال آیا۔ جس کے واقعات چشم دید اپنے پڑوس میں مل گئے۔ صرف نام تبدیل کرنے اور تھوڑا سا بڑھانے کی ضرورت ہوئی۔ اس میں بہت سی باتیں مثلاً استانی صاحبہ کا سلائی منگانا۔ اور کٹ پیس کے کپڑے تیار کرانا۔ ان کو کمیشن دے کر فروخت کرانا۔ بخیہ کرنے کے لئے ٹوپیاں منگانا۔ یہ سب باتیں ہو گزری ہیں۔ کیونکہ اختری بیگم نہ سہی۔ اس کی دوسری بہنوں کے لئے اس کی شفیق اُستانی نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اس لئے محض ایک افسانہ نہیں۔ بلکہ اصل واقعات ہیں۔ جن کو میں نے اپنی بہنوں کی دلچسپی اور فائدے کے لئے ترتیب دیا ہے۔

مجھے اُمید ہے۔ کہ جہاں فارغ البال اور ہنرمند بہنیں اس

کو پڑھ کر محظوظ ہوں گی۔ وہیں ان کے دل میں اپنی غریب ہم جنسوں کی امداد کا خیال آئے گا۔ اختری کی اُستانی کی طرح ان میں بھی بیکسوں کی بہبودی کی کوشش کا جذبہ پیدا ہوگا۔ وہیں نادار اور ضرورت مند بہنوں کو بھی اختری بیگم کی طرح اپنے ہاتھ پیروں اور عقل و ہمت کے بھروسے اپنی حالت کو سدھارنے کا شوق پیدا ہوگا۔ اگر ایک گھر بھی میری اس ناچیز کوشش سے سنبھل گیا۔ تو میں سمجھوں گی۔ کہ مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔ والسلام

خاکسار
ظفر جہاں بیگم

اختری بیگم کے خاندانی حالات

اور پیدائش

عبداللہ خاں کا بچپن اور جوانی کا زمانہ تو خاصا آرام سے گزرا۔ مگر اب کہ بڑھاپے نے فوجی ملازمت سے پنشن لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ بہت تنگی سے بسر ہوتی تھی۔ اولاد زیادہ نہ تھی۔ صرف ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکی کی شادی ہوگئی تھی۔ لیکن کسی بات پر ایسی ناچاقی اس کے شوہر سے ہوئی۔ کہ پھر اس نے عمر بھر بیوی کی خبر نہ لی، خاں صاحب کے اکثر دوستوں نے مشورہ دیا۔ کہ نان و نفقہ کی نالش کر دو۔ مگر اس کو جہالت کہئے یا شرافت۔ کہ خاں صاحب نے پرانے شرفا کے قول کے مطابق ہمیشہ یہی جواب دیا۔ کہ بھائی میری سات پشت میں بھی کبھی کسی عورت کی ڈولی کچہری نہیں گئی ہے۔ میں اس بڑھاپے میں اس ذلت کو گوارا نہیں کر سکتا، میری لڑکی اگر واقعی میری لڑکی ہوگی۔ تو اسی دہلیز پر اس کا سر سفید ہو جائے گا۔ لیکن وہ کبھی کچہری عدالت کا نام نہ لے گی۔

لڑکے کو تھوڑا بہت پڑھا لکھا کر اس قابل کر دیا تھا۔ کہ وہ کسی مہاجن کا منیب ہو گیا تھا۔ تنخواہ تو واجبی ہی تھی۔ مگر اوپر کی آمدنی بہت کافی تھی۔ اور وہ نہایت ٹھاٹھ سے رہتا تھا۔ خاں صاحب بے چارے اکثر اس کو سمجھاتے۔ اور دوزخ کے عذاب سے ڈراتے۔ مگر آج کل کے لڑکے ایسی باتیں کب سنتے ہیں۔ اس کا تو یہ قول تھا۔ کہ اب تو آرام سے گزرتی ہے۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔ مگر شاباش ہے۔ بڑے میاں کی ایمان داری کو کہ بیٹے کے گھر ایک ایک وقت میں آٹھ آٹھ ہانڈیاں پکتیں۔ اور اپنے پرائے سبھی کھاتے۔ لیکن اس خدا کے بندے نے اپنی دال یا چٹنی روٹی کے سوا کبھی بیٹے کی ہانڈی کا نمک تک نہ چکھا۔

سعد اللہ خاں تقدیر کے بڑے دھنی تھے۔ کہ خدا نے بیوی بھی دی۔ تو ایسی۔ کہ جیسی حسن صورت میں لاجواب ویسی ہی حسن سیرت میں انتخاب۔ غرض دنیاوی عیش و راحت کا پورا پورا سامان ان کو حاصل تھا۔ بوڑھے ماں باپ کو بچے کی بڑی آرزو تھی۔ وہ بھی خدا نے پوری کی۔ شادی کو ابھی ڈیڑھ سال بھی پورا نہ ہوا تھا۔ کہ خدا نے سعد اللہ خاں کو ایک ننھی منی سی خوب صورت لڑکی عطا فرمائی۔ اگرچہ ارمان لڑکے کا تھا۔ مگر دادا دادی کو یہ لڑکی بھی سات بیٹوں کے برابر تھی۔ ساتویں دن بڑی دھوم دھام سے عقیقہ ہوا۔ اور اختری بیگم نام رکھا گیا۔ دادا دادی اور پھوپھی تینوں اس بچی پر جان فدا کرتے تھے۔ رات دن انہیں کے گلے کا ہار رہتی۔ اس طرح چاؤ چونچلوں میں رہ کر اختری بیگم ابھی پونے دو ہی سال کی ہوئی تھی۔ کہ یکایک غریب کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ شہر میں طاعون کی وبا پھیلی۔ اور

اس کی ماں بے چاری اچھی خاصی بھلی چنگی دو روز اس مرض میں مبتلا رہ کر ہمیشہ کے لئے اس پیاری بچی سے رخصت ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؁

اختری غریب کو ابھی اس مصیبت کا احساس بھی نہ تھا۔ وہ صرف دو تین دن ماں کو یاد کر کے بھول بھی گئی۔ اور بدستور اپنے تینوں چاہنے والوں کے ہاتھوں میں پرورش پاتی رہی۔ جن کی محبت اب اور زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی ماں کی ابھی برسی نہ ہوئی تھی کہ باپ کی دوسری شادی ہو گئی۔ اور نئی دلھن کی صورت دیکھ کر بچی کو وہ بالکل بھول گیا۔ ہماری بھولی بھالی اختری کو ابھی اس کی تمیز نہ تھی۔ وہ تو اپنے دادا دادی ہی کو ماں باپ سمجھتی تھی۔ اور ان کی محبت کے آگے اور کسی کی کوئی حقیقت نہ جانتی تھی ؁

دوسرے بیاہ کو ابھی چھ مہینے بھی نہ ہوئے تھے۔ کہ ایک غبن کے معاملہ میں سعد اللہ خاں کی نوکری جاتی رہی۔ وہ تو خدا نے خیر کی۔ کہ مقدمہ چلتے چلتے رہ گیا۔ ورنہ عزت آبرو پر بھی پانی پھر جاتا۔ نوکری جانے کا بہت صدمہ ہوا۔ مگر خدا نے عزت بچالی۔ یہی اس کا کیا کم احسان تھا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ مگر اب کریں تو کیا کریں اور نہ کریں تو کھائیں کیا۔ نوکری کے زمانے میں اول تو کبھی کچھ بچانے کا خیال نہیں کیا۔ اور وہ ہوتا بھی تو کے دن چلتا۔ مثل مشہور ہے۔ کہ خالی بیٹھ کر کھانے سے تو کنوئیں بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ دوسری نوکری کی بہت تلاش کی۔ مگر ساکھ اٹھ چکی تھی۔ نوکری کا ملنا آسان نہ تھا۔ کچھ دنوں گھر کا اسباب جو ضرورت سے زیادہ

تھا۔ بیچ بیچ کر گزر ہوئی۔ پھر سوچا۔ کہ یہ آخر کب تک ساتھ دے گا
کچھ نہ کچھ روزگار کرنا چاہیئے۔ آخر بیوی کی صلاح سے ضروری چیزیں
چھوڑ کر باقی سب سامان بیچ کر کچھ روپیہ نکالا۔ اور اس سے مختصر سا
سامان بساط خانے کا خرید کر شہروں شہروں پھیری کو جانا شروع کیا
ادھر بیوی بھی سگھڑ اور دستکار تھیں۔ جب تک میاں پردیس میں رہتے
یہ اپنے ہاتھ کی محنت سے اپنا خرچ چلاتیں۔ اور جب سعد اللہ خان
گھر آتے۔ تو یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے۔ کہ روپوں کی تھیلیاں لاتے
یا قرض دار ہو کر آتے۔ مگر سنا تو ہمیشہ یہی۔ کہ "اب کے اتنا ٹوٹا آیا"۔
لیکن نہ معلوم کیا وجہ تھی۔ کہ باوجود برابر ٹوٹا آنے کے انہوں نے
مرتے دم تک اس روزگار کو نہ چھوڑا۔ سوائے کسی مجبوری کے کہ دُکھ
بیماری میں تو خیر دو چار مہینے کو بیٹھ رہتے تھے۔ مگر اس کے سوا
ہمیشہ اپنا یہی کام جاری رکھتے تھے۔

جب سے نئی بیوی کے یہاں بال بچے ہونے شروع ہوئے
اور زیادہ خرچ بڑھ گیا تھا۔ پھر کھانا بھی بُرا نہیں ہوتا تھا۔ اور کپڑا
تو اچھا ہوتا ہی تھا۔ اگر پوچھئے۔ کہ یہ سب کہاں سے آتا ہے۔ تو
اصل حقیقت تو خدا ہی کو معلوم ہے۔ لیکن بظاہر تو یہی تھا۔ کہ روزمرہ
کا کام بیوی کے سگھڑاپے اور دستکاری سے چلتا ہے۔ اور جوتی
کپڑا وغیرہ ان کے میکے والوں کی عنایت سے مہیا ہوتا ہے۔ لطف
یہ کہ میکے میں باپ بھائی کوئی نہ تھا۔ یہ جتنے احسانات تھے۔ سب
چچازاد اور پھوپھی زاد بھائیوں کے تھے۔ جنہوں نے بہن کے ساتھ
اس کے بچوں اور شوہر کا خرچ بھی پورا پورا اٹھا لیا تھا۔ خدا کو دیکھا

نہیں عقل سے پہچانا۔ بھلا آج کل کے زمانے میں بیاہی بیٹی کا خرچ اٹھانے بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹتے ہیں۔ اور حقیقی باپ بھائی تک نہیں بھگت سکتے۔ ان کے رشتہ کے بھائیوں کو ان کی ایسی کہاں کی ماننا تھی۔ مگر اس میں مصلحت یہ تھی۔ کہ اگر سعد اللہ خاں کا نام ہوگا تو اس میں اختری بھی برابر کی ساجھے دار ہوگی۔ لیکن سوتیلی ماں اور اس کے میکے والوں کے روپے میں اس غریب کا کیا حق؟

اندھیر یہ تھا۔ کہ باپ بھی بے شرم بن کر بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ اور یہی ظاہر کرتا تھا۔ کہ میں محض نکما ہوں۔ اور بیوی اور اس کے میکے والوں کے رحم و کرم پر گزر اوقات ہے۔ بوڑھے ماں باپ سب دیکھتے اور سمجھتے تھے۔ مگر مجبوری یہ تھی۔ کہ اپنا بیٹا ہی نالائق تھا۔ کرتے تو کیا کرتے۔ ناچار غریب اختری باپ کی امداد سے بالکل محروم ہو کر دادا کی قلیل پنشن میں شریک کر لی گئی۔ اور نہایت تنگی کے ساتھ ان چاروں بندوں (یعنی عبد اللہ خاں ان کی بیوی لڑکی اور پوتی) کی گزر ہونے لگی۔ اختری کے لئے محبت کی ان کے پاس اب بھی کمی نہ تھی۔ البتہ روپے سے بے چارے مجبور تھے۔ مگر پھر بھی حتی المقدور اس کو راحت و آرام پہنچانے کی ہر طرح کوشش کرتے اور اپنے سے بہتر کھلاتے پہناتے تھے ۔
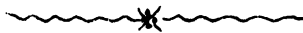
تعلیم اور شادی

جب خیر سے اختری بیگم نے پانچویں برس میں قدم رکھا۔ تو عبداللہ خاں نے اپنے ایک دوست کے ہاں جن کا مکان بالکل قریب تھا۔ پڑھنے بٹھا دیا۔ یہ گھرانا اس کام کے لئے مشہور تھا۔ اور محلّہ کی بہت سی لڑکیاں یہاں سے معمولی اُردو اور قرآن شریف پڑھ کر اٹھی تھیں۔ اب وہ روز صبح اُٹھ کر اپنے مکتب چلی جاتی۔ اور بارہ بجے تک پڑھ کر دوپہر کی چھٹی میں گھر آتی اور کھانا کھا کر دو بجے پھر چلی جاتی۔ اس طرح بارہ برس کی عمر تک مکتب جاتی رہی۔ اور اس عرصہ میں اس نے قرآن شریف ختم کر لیا۔ اُردو کی کتابیں بے تکلّف پڑھنے لگی۔ ذرا دقّت کے ساتھ خط بھی پڑھ لیتی۔ اور تھوڑا بہت لکھنا اور سینا بھی سیکھ لیا۔ عبداللہ خاں کی جُوں جُوں عمر زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ طرح طرح کے عوارض پیدا ہوتے جاتے تھے۔ مثل ہے "پیری و صد عیب"۔ دن بدن نحیف و لاغر ہوتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن پیغام اجل آ پہنچا۔ اور بے چارے بڑے میاں اپنے چھوٹے سے کنبے کو بالکل بے یار و مددگار صرف خدا کے بھروسے پر چھوڑ کر راہی ملکِ عدم ہوئے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ؀

خاں صاحب کی موت سے جو کچھ صدمہ ان کی بیوی۔ بیٹی

اور پوتی کو ہوا۔ وہ تو ایک قدرتی بات تھی۔ خاص کر اختری کو کہ
ماں کا مرنا تو اسے معلوم ہی نہ ہوا تھا۔ مگر اب وہ بفضل خدا سیانی
تھی۔ دادا کی موت سے اُسے اتنا ہی صدمہ ہوا۔ جتنا کسی بیٹی
کو اپنے شفیق باپ کا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ باپ اگرچہ موجود تھا۔ مگر
اس کی شفقت کا مزہ کبھی اس غریب نے چکھا ہی نہ تھا۔ یہ تو
دادا ہی کو باپ سمجھتی تھی۔ اس لئے جتنا اسے رنج ہوا بجا تھا۔ مگر
سب سے بڑا رونا ان غریبوں کو اپنی روٹیوں کا تھا۔ کیونکہ خاں
صاحب کی آنکھ بند ہوتے ہی ان کی پنشن بھی بند ہو گئی۔ جس پر
ان کی روٹی کا دارومدار تھا۔ سعداللہ خاں کی آنکھوں پر ایسے
پردے پڑے تھے۔ کہ اب بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں۔ اور جو
راہ انہوں نے شروع سے اختیار کی تھی۔ اُسی پر چلتے رہے لیکن
صد آفریں ہے۔ بہن کی ہمت کو اس نے مردانہ وار ہمت کی۔ اور
اس بات کا بیڑا اُٹھایا۔ کہ میں اپنی محنت سے دو چار پیسے پیدا کروں
گی۔ اور جس طرح ہو سکے گا اپنی ضعیف ماں اور صغیر السن بھتیجی
کی خدمت اور پرورش کروں گی ؞

چنانچہ اب ان کا معمول ہو گیا۔ کہ دن بھر سلائی کڑھائی کرتیں
اور جو اُجرت ملتی۔ اس سے شام کو سودا منگاتیں اور پکا رینْدھ کر
ماں اور بھتیجی کے آگے رکھتیں۔ تینوں سر جوڑ کر کھا لیتیں۔ اور
خدا کا شکر کر کے سو رہتیں۔ لیکن اب ان کو مجبوراً اختری کو مکتب
سے اُٹھا لینا پڑا۔ کیونکہ اول تو وہ سیانی ہو گئی تھی۔ لوگ نام دھرنے
تھے۔ کہ اتنی بڑی لڑکی دن بھر گھر سے باہر رہتی ہے۔ دوسرے

جب خود ہر وقت محنت مزدوری کے کام میں رہتی تھیں۔ تو گھر کے کام کے لئے بھی ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ پھر غریب کی بچی تھی۔ کھانا پکانا اور گھر گرستی کے اور کام سیکھنے ضروری تھے۔ یہی سب سوچ سمجھ کر انہوں نے اس کو مکتب سے اٹھالیا۔ اور رفتہ رفتہ ہانڈی چولھا اور ضعیف دادی کے کل کام اس کے سپرد کر دیئے۔

اختری نے تیرھویں برس میں جوں ہی قدم رکھا پھوپھی کو اس کی شادی کی فکر پڑ گئی۔ کیونکہ اب اس کے شوق کے دن تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھیں۔ کہ ہم دو دکھیاریوں کے ساتھ وہ بھی مصیبت بھرتی رہے۔ کہتی تھیں۔ کہ شاید خدا اس کی تقدیر سے کسی بھلے مانس سے واسطہ ڈال دے۔ اور یہ چین سے کھائے پیئے۔ زندگی کا اعتبار نہیں۔ اگر اس وقت میری ہی آنکھیں بند ہو گئیں۔ تو کون اس کی فکر کرے گا۔ باوا کو اس کا خیال نہیں۔ دادی اپنی ضعیفی سے پہلے مجبور تھیں۔ جب سے ابا جان کا انتقال ہوا میں دیکھتی ہوں۔ کہ ان کے حواس میں بھی فرق آگیا ہے۔ ان سب خیالات نے کچھ ایسا ان کے دماغ پر تسلط کیا۔ کہ راتوں کی نیند تک اڑ گئی۔ اور ہر وقت یہی ایک وظیفہ تھا۔ کہ اے خدا تو مجھے اس بچی کے فرض سے سبکدوش کر دے۔ آئے گئے کے سامنے یہی ذکر۔ نائیوں مشاطاؤں سے یہی تقاضا۔ کہ کہیں سے رقعہ لاؤ۔ مثل مشہور ہے۔ کہ جس گھر میں بیری ہوتی ہے۔ اس میں ڈھیلے ضرور آتے ہیں۔ جہاں سیانی لڑکی ہو گی۔ وہاں پیغام بھی ضرور آئیں گے۔ پھر مشاطاؤں وغیرہ سے خود کہہ کر منگاتے جائیں۔

اور انہیں انعام کا لالچ دیا جائے۔ تب تو پیاموں کی کوئی گنتی ہی نہیں رہتی۔ چنانچہ اختری کے لئے بھی پیغاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مگر پردیس کے پیغاموں سے ان کی پھوپھی کانوں پر ہاتھ دھرتی تھیں۔ ان کا مقولہ تھا۔ کہ "بیوی میری بچی بن ماں کی ہے۔ باوا کا جو رنگ ہے۔ وہ دنیا دیکھ رہی ہے۔ میرے پاس اتنا پیسہ نہیں۔ کہ پردیس سے بلاؤں چلاؤں۔ میری بچی پردیسن ہو جائیگی تو وہ میری صورت کو ترسے گی۔ اور میں اس کی صورت کو پھڑک پھڑک کر مر جاؤں گی۔ اپنے شہر میں ہو گی۔ تو بلا سے یہ تو ہو گا۔ کہ اگر مجھے اتنی توفیق بھی نہ ہوئی۔ کہ اس کی ڈولی کا کرایہ دوں۔ اور چار دن کو بلا کر رکھوں۔ تو خود ہی جس وقت دل گھبرائے گا۔ رات بے رات برقعہ اوڑھ کر چلی جاؤں گی۔ اور اپنی بچی کی صورت دیکھ کر مامتا ٹھنڈی کر لوں گی"۔ اب رہے شہر کے پیام ان میں کوئی ڈھنگ کا نہ معلوم ہوا۔ کہیں لڑکا اچھا تھا۔ تو خاندان برا تھا۔ کہیں خاندان اچھا تھا۔ تو لڑکا جاہل۔ آوارہ اور نکھٹو تھا۔ غرض ہر ایک میں کوئی نہ کوئی فی نکلی۔ کئی مہینے اسی طرح گزر گئے۔ مگر کوئی بات ڈھنگ کی سمجھ میں نہ آئی۔

عبداللہ خاں مرحوم کے چھوٹے بھائی جو عرصہ ہوا انتقال کر گئے تھے۔ چار لڑکیاں اور دو لڑکے چھوڑ مرے تھے۔ جن میں سے ایک لڑکی اور ایک لڑکا اب تک کنوارا تھا۔ اور مدت سے اس کی ماں بہنوں کا اختری پر دانت تھا۔ اس کی موہنی صورت اور پیاری پیاری ادائیں بچپن ہی سے ان لوگوں کے دل میں

گھر کر چکی تھیں۔ مگر اپنے لڑکے کی طرف دیکھ کر اب تک پیام دینے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ لڑکے دونوں نالائق نکلے۔ یہاں تک کہ باپ دادا کے وقت کا مکان تک بیچ کر کھا چکے تھے۔ پڑھا لکھا خاک نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ بڑے صاحب تو بالکل ہی نکھٹو تھے۔ ماں بڑے ارمانوں سے اپنی بھتیجی بیاہ لائی تھیں۔ مگر اس غریب لڑکی کی وہ درگت تھی۔ کہ جب میاں صاحب کو کارچوب کا کام مل گیا۔ تو چولھا گرم ہو گیا۔ ورنہ کئی کئی دن فاقے سے پڑ رہتے۔ اور کارخانے میں جا کر صورت تک نہ دکھاتے۔ چھوٹا بھائی اسداللہ خاں بڑا محنتی تھا۔ اور کسی کام کو عیب نہ سمجھتا تھا۔ مگر پورا پٹھان کا پوت۔ گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت۔ زبان کا اتنا پھوہڑ اور مزاج کا اس درجہ خراب۔ کہ گھر میں اور باہر کوئی بھی اس سے خوش نہ تھا۔ اسی وجہ سے کوئی کام جم کر نہ ہو سکتا تھا۔ آئے دن نوکری چھوٹ چھوٹ جاتی تھی۔ اب ادھر تو وہ کوئی چار مہینے سے پندرہ روپے ماہوار کے نوکر تھے۔ اُدھر اختری کی پھوپی کو بھتیجی کی شادی کی جلدی پڑی ہوئی تھی۔ اس موقع کو اسداللہ خاں کی ماں بہنوں نے غنیمت سمجھا۔ اور ایک دن سب کی سب اختری کے گھر آ دھمکیں۔ اور ہمت کرکے پیغام دیا۔ بڑا اصرار تھا۔ کہ ہم تو ہاں کرائے بغیر نہ اُٹھیں گے۔ آخر گھر کا لڑکا ہے۔ کچھ پوچھنا گچھنا تو ہے نہیں۔ اس کے عیب ثواب سب تمہیں معلوم ہیں۔ مگر اختری کی پھوپی نے کہا۔ کہ ہاں۔ یہ تو تمہارا کہنا ٹھیک ہے۔ مگر آخر ہمیں بھی صلاح مشورہ کرنا ہے۔ بصد مشکل ایک ہفتہ کی مہلت ملی ؛

شام کا کھانا کھا کر اُدھر تو وہ لوگ سوار ہوئیں۔ اِدھر اس نسبت پر چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ رفتہ رفتہ گھر سے نکل کر محلہ تک میں چرچا پھیلا۔ اور جس نے بھی سُنا۔ کبھی اپنی رائے دینے میں بخل نہ کیا۔ کسی نے فرمایا "بھئی اپنوں کی کیا بات ہے۔ جو تمہاری ہڈی۔ وہ ان کی۔ اپنے خاندان کی جورو گوشت پوست سب ایک ہی ہوتا ہے پھر جو تمہیں ان کی اور انہیں تمہاری لگے گی۔ وہ غیر کو تھوڑی لگے گی۔ مثل مشہور ہے۔ کہ اپنا مارے تو چھاؤں میں بٹھائے۔ اور غیر مارے تو دھوپ میں بٹھائے۔ لڑکے میں یہ عیب ضرور ہے۔ کہ مستقل مزاج نہیں ہے۔ ایک کام کو جم کر نہیں کرتا۔ مگر محنتی خوب ہے۔ بڑے کی طرح نکما نہیں۔ جو کام بھی مل جاتا ہے۔ کر لیتا ہے۔ اور ابھی عمر ہی کیا ہے۔ لڑکپن کا زمانہ ہے۔ گھر داری کا بوجھ پڑے گا خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ بس بوا اب تم کچھ پس و پیش نہ کرو۔ اور اللہ کا نام لے کر شادی کر دو۔" کوئی کہتا "نوج بوا خدا نہ کرے۔ کہ کوئی ان کے گھر بیٹی دے۔ بڑی بہو کیا سکھ دیکھ رہی ہے۔ جو یہ جا کر راج کرے گی۔ ان کے دونوں لڑکے نالائق نکلے۔ اپنے کا ٹھیکرا تک بیچ کر کھا گئے۔ پھر بڑا اگرچہ نکما ہے۔ مگر مزاج کا اس سے کہیں اچھا ہے۔ ان کے تو اس نسبتی پر وہ دماغ ہیں۔ کہ الامان جس وقت طیش میں آئیں گے۔ تو سات پشت تک کھُن ڈالیں گے۔ بلکہ ہاتھ تک اُٹھانے میں انہیں باک نہ ہو گا۔ جب وہ اپنے بڑوں کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے۔ تو بیوی غریب کس گنتی میں ہو گی۔ ابھی بچی کی عمر ہی کیا ہے۔ جو تمہیں ایسی جلدی پڑ گئی۔ برس چھ مہینے تو اور

دیکھو۔ شہر میں لڑکوں کا کال نہیں۔ اچھے سے اچھے موجود ہیں"
غرض جتنے مُنہ اتنی باتیں جتنے دماغ اتنی رائیں۔ روزرات کو سب کاموں سے فراغت پاکر دس بجے سے میٹنگ شروع ہوتی۔ اور بارہ بجے تک ہوتی رہتی۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔ اُدھر لڑکے والوں کا تقاضا ہر وقت سر پر تھا۔ ان لوگوں نے دروازے کی مٹی لے ڈالی۔ خود بھی کہا۔ دوسروں سے بھی کہلوایا۔ خوشامد بھی کی۔ اپنایت کا دباؤ بھی ڈالا۔ غرض جتنے حربے کام دے سکتے تھے۔ سب ہی استعمال کئے۔ اور آخر کار فتح مند ہوئے۔ لڑکی والوں نے سوچا۔ کہ اپنے پاس دینے لینے کو تو کچھ ہے نہیں۔ امیر گھر لڑکی جائے گی۔ تو مُفت میں ذلیل ہوگی۔ غریب کی غریبوں ہی میں اچھی نبھتی ہے۔ اس کے علاوہ غیر جگہ کی لاکھ تحقیقات کرلو۔ مگر بعد میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور نکلتا ہے۔ یہ آپس کا لڑکا ہے۔ کوئی بات اس کی ہم سے پوشیدہ نہیں۔ مزاج میں تلوّن کا عیب ضرور ہے۔ کہ ایک کام جم کر نہیں کرتا۔ تو یہ محض لڑکپن ہے۔ ویسے وہ پرلے درجے کا محنتی ہے۔ بڑے بھائی کی طرح نکما نہیں۔ گھرداری کا بوجھ پڑکر خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔

غرض کچھ یہ سوچا سمجھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ۔ کہ پُرانے خاندانوں میں بَر کے انتخاب کے وقت جہاں اپنایت کا شائبہ بھی ہوتا ہے۔ وہاں پوری ایمانداری سے کام نہیں لیا جاتا۔ اور عزیزیت کی پاسداری زیادہ ملحوظ خاطر رہتی ہے۔ اسی بنا پر اسداللہ خاں کو بھی ان سے بہتر لڑکوں پر ترجیح دی گئی۔ اور آخر کار پالا انہیں کے

ہاتھ رہا ۔

دونوں طرف تیاریاں شروع ہوگئیں۔ بے چاروں کے پاس رکھا ہی کیا تھا۔ جو تیاری میں زیادہ دن لگتے۔ دو مہینے میں دونوں طرف سب سامان لیس ہوگیا۔ اختری بیگم کی پھوپی سے جو کچھ بھی ہو سکا۔ انہوں نے کیا۔ اس کی ماں کا جو کچھ تھوڑا بہت زیور۔ برتن۔ کپڑا اور پلنگ وغیرہ انہوں نے سنیت سنیت کر رکھا تھا۔ وہی اس وقت کام آیا۔ اور ان بے چاری کی حیثیت کے لائق خاصی ان کی گڑیا سنور گئی۔ کھانے وغیرہ کے انتظام میں بادا بھی دس پانچ روپے لگا کر شریک ہوگئے۔ سوتیلی ماں بھی ایک جوڑا دے کر سُرخ رو بن گئیں۔ خیر یہ تو جو کچھ ہوا ہوگیا۔ اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ ہماری اختری بیگم کی آیندہ زندگی کیسی گزرتی ہے۔ خدا سے دُعا ہے۔ کہ وہ کنوار پتے کے ساتھ اُس کی بدنصیبی کا بھی خاتمہ کر دے۔ اور جو مصیبتیں اس غریب نے اب تک اٹھائی ہیں۔ خداوند کریم اپنی رحمت سے ان کا نعم البدل عطا فرمائے آمین ۔

سُسرال کی دُنیا

میکے سے رخصت ہوکر اختری بیگم سُسرال پہنچیں۔ اس وقت تو خیر رات تھی۔ پھر دلھن بنی ہوئی دبی سُکڑی جہاں لے جا کر بٹھا دیا بیٹھ گئیں۔ صبح اُٹھ کر مکان دیکھا۔ آٹھ آنے مہینے کی ایک تین در کی کھپریل ہے۔ اسی میں ایک طرف چکی چولھا ہے۔ قریب ہی ایک پُرانا صندوق رکھا ہے۔ جس کے اوپر مختصر سے برتن چُنے ہوئے ہیں۔ اُوپر مچان بنا ہوا ہے جس پر جنس کی ہنڈیاں وغیرہ رکھی ہیں۔ صندوق کے پاس ایک چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا تخت پڑا ہوا ہے۔ اس کے نیچے لکڑی اُپلوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ تخت سے ملی ہوئی دو بانس کی چارپائیاں ہیں۔ ایک پر اسد اللہ خاں دوسری پر ان کی والدہ چھوٹی لڑکی کو لے کر سوتی تھیں۔ سرہانے کی طرف میلے کچیلے پھٹے پُرانے بستر لپٹے رکھے تھے۔ وہیں ایک پُرانا مٹکا جس پر کائی کی کثرت سے سبز گنبد کا دھوکا ہوتا تھا۔ اور ایک گھڑا لڑک رہا تھا کچی زمین پر ان برتنوں کے رکھنے سے جہاں کیچڑ ہونا ضروری تھا خود بخود گڑھے بن گئے تھے۔ جن کو گھڑونچی کا قائم مقام سمجھ لیجئے۔ پھر پانی اونڈیلتے وقت باری باری سے ہر طرف ان پر کیچڑ تھپی رہتی تھی۔ اُوپر کہیں چھینکے لٹک رہے تھے۔ جو دھوئیں کی کثرت سے بالکل

سیاہ ہو گئے تھے - ایک پر لہسن پیاز کی ٹوکری رکھی ہوئی تھی - دو خالی تھے - جن پر رات کا بچا ہوا کھانا رکھا جاتا تھا - ایک کھونٹی پر مٹی کے تیل کا ادھا ٹنگا ہوا تھا - دوسرے پر میلے کپڑوں کی پوٹلی - دو طاقوں میں آٹھ دس میلی چکٹی بوتلیں شیشیاں کچھ پڑیاں اور کلھیاں رکھی تھیں *

چولھے کی سیدھ میں دھوئیں سے سیاہ دیوٹ پر جلانے کی ڈبیا رکھی تھی - کھپریل کے آگے چار چارپائیوں کا صحن چھوڑ کر دو قدمچوں کا ایک چھوٹا سا پاخانہ تھا - اور اسی کے برابر دروازہ جس پر بے پردگی ہونے کے خوف سے ایک ٹاٹ کا پردہ ڈال دیا گیا تھا مگر اب وہ اس قدر بوسیدہ اور سوراخ دار ہو گیا تھا - کہ جس غرض سے ڈالا گیا تھا - وہ اس سے بالکل پوری نہیں ہو سکتی تھی + پاخانے کی دیوار سے ملا ہوا ایک بڑا سا کوڑے کا ڈھیر تھا - جو روز کی جھاڑو کے بعد اکٹھا کر دیا جاتا تھا - اور مہترانی شاید عید بقرعید کو اٹھاتی ہو - ورنہ معلوم تو یہی ہوتا تھا - کہ برسوں سے پڑا ہوا ہے - اس انبار کے آس پاس بہت سے جنگلی درخت اگ آئے تھے - جن کی وجہ سے مکان پر جنگل کی سی وحشت برستی تھی *

بہو کے آنے سے پہلے اس کے لئے بھی کوئی کونا مخصوص کرنے کی ضرورت تھی - اس لئے اسی کھپریل کا ایک در بیچ میں بانس کی ٹٹی کھڑی کر کے علیحدہ کر دیا تھا - اور دونوں طرف سے اس کو لیپ پوت کر جالیوں کو بند کر دیا گیا تھا - اور اسی میں اس کے جہیز کی مختصر سی مسہری بچھا کر اس کے نیچے جہیز کا ایک چوبی

چھوٹا صندوق جس میں برتن تھے۔ اور کپڑوں کے دو چھوٹے چھوٹے ٹرنک رکھ دئے تھے۔ جہیز کی چوکی بھی اس کے نیچے کر دی گئی تھی۔ جو ایک طرف مسہری سے ذرا سی نکلی ہوئی تھی۔ اس حصہ پر اختری کا لوٹا کٹورا اور پاندان رکھ دیا گیا تھا۔ سرہانے طاق میں تیل کی شیشی آئینہ۔ کنگھی تیل کی پیالی اور سرمہ دانی سلائی رکھ دی تھی ۔

گھر اور گھر والوں کا رنگ دیکھ کر غریب لڑکی کا سانس نیچے کا نیچے اور اوپر کا اوپر رہ گیا۔ میکے میں بھی اگرچہ اس نے آنکھ کھول کر تنگدستی اور افلاس ہی دیکھا تھا۔ مگر پھر بھی وہاں کی حالت یہاں سے بہتر تھی۔ مکان اگرچہ اب اس کا بھی کھنڈر ہو چکا تھا لیکن پرانے وقتوں کی یادگار۔ کھلا ہوا اور کشادہ۔ مکانیت بھی اس سے زیادہ تھی۔ پھر مکین بھی اس سے بہتر تھے۔ اور یہ ایک مانی ہوئی بات ہے۔ کہ مکان کی اچھائی برائی کا تعلق زیادہ تر مکین کی ذات سے ہوتا ہے۔ اختری بیگم کی پھوپی اس سلیقہ کی آدمی تھیں کہ اس غریبی میں بھی اپنے گھر کو جھاڑ پونچھ اور لیپ پوت کر ہمیشہ صاف ستھرا رکھتیں۔ اور ہر چیز اپنی اپنی جگہ اس قرینے سے رہتی تھی۔ کہ اندھیرے میں جا کر آنکھ بند کر کے اٹھا لائیے ۔

یہاں روپے کے ساتھ سلیقہ بھی عنقا تھا۔ اس لئے اور زیادہ نیستی بڑھ گئی تھی۔ کھانے کی باری آئی۔ تو وہ بھی ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ اس قلیل آمدنی میں ہو سکتا ہے۔ اور خاص کر اس صورت میں کہ ماں بچاری تین بیٹیاں بیاہ چکی تھیں۔ اور ابھی ایک اور بیاہنے کو بیٹھی تھی۔ اس کی فکر بھی اسی میں تھی۔ پھر بیٹے کی

عادت سے واقف - ہر روز کھٹکا لگا رہتا تھا - کہ صاحبزادے برخوردار آ کر کہیں خوش خبری نہ سنا دیں - کہ روزگار کو لات مار آئے - اس لئے جہاں تک ہو سکتا - کس کس کر خرچ کرتیں - اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ بچانے کی فکر رہتی - پھر آخر پندرہ روپے کی اس مہنگے سمے میں حقیقت ہی کیا ہوتی ہے - پہلے اس میں تین بندے تھے - اب بہو ملا کر چار ہو گئے - اور بھی تنگی بڑھ گئی - غرض اختری بدنصیب نے بیاہ کے بعد بھی کوئی آسائش نہ پائی ؛
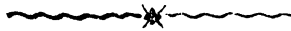
نئی مصیبت

یہاں تک بھی غنیمت تھا۔غضب یہ ہوا۔کہ چار ہی مہینے بعد خاں صاحب اپنی پرانی عادت کے مطابق ملازمت کو خیرباد کہہ کر گھر آ بیٹھے۔اور پورا مہینہ بھر بے کاری میں گزر گیا۔یہی خیریت ہوئی۔کہ مہینہ بھر بعد پھر روزگار سے لگ گئے۔مگر مرغی کو نکلے ہی کا لھاؤ بہت ہوتا ہے۔ان کے لئے مہینہ بھر کی بے کاری ہی کیا کم تھی۔بیس ہی دن میں سب جوڑا بٹورا خاتمے لگ گیا۔باقی دس دن میں قرضے اور فاقوں کی نوبت آ پہنچی۔اختری بے چاری یہ سب تماشے دیکھتی اور گم سُم رہتی تھی۔اس کے خیالات کا ہمیں علم نہیں۔کیونکہ آج تک کبھی اس غریب نے ایک لفظ بھی شکایت کا مُنہ سے نہیں نکالا۔مگر جس دن سے شادی ہوئی۔اُسے کچھ ایسی چُپ لگی۔کہ برسوں ہم نے اُسے زندہ دلی کے ساتھ ہنستے بولتے نہ دیکھا ؛

البتہ ایک بات سے ضرور تعجب ہوتا ہے۔کہ سب سے بڑا ڈر جو خاں صاحب کے مزاج کا تھا۔اور جس کا حال سُن سُن کر اختری کا چلوؤں خون خشک ہوتا تھا۔بیوی کی صورت دیکھ کر بالکل بدل گیا۔اور وہ شخص جس نے کبھی ماں سے بھی سیدھے مُنہ بات

نہیں کی۔ اور جس کی صورت سے بہنیں لرزتی تھیں۔ بیوی سے ایسی مہربانی اور نرمی کے ساتھ پیش آتا۔ کہ جس کا اختری کو کبھی وہم و گمان بھی نہ تھا۔ وہ اسی کو خدا کی بہت بڑی رحمت سمجھتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے۔ کہ شوہر کو اپنے اُوپر مہربان دیکھ کر وہ اپنا سارا رنج بھول جاتی تھی۔ اس مصیبت کی زندگی میں اگر اس کو کسی طرف سے تسکین تھی۔ تو صرف شوہر کے تاؤ سے۔ ورنہ اس کے لئے دُنیا دوزخ بن جاتی ساس بھی خوش تھیں۔ کیونکہ بہو نے بہت جلد گھر کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ اور رفتہ رفتہ تمام کام اپنے ذمے لے لئے تھے۔ اور بغیر کچھ خرچ کئے محنت اور سلیقے سے جتنی بھی گھر کی درستی ہو سکتی تھی۔ وہ کرتی تھی۔ مکان کو ہمیشہ جھاڑ پونچھ اور لیپ پوت کر صاف رکھتی۔ جس جگہ کوڑے کا انبار تھا۔ وہاں کی زمین صاف کر کے اس نے ایک چھوٹی سی خوب صورت کیاری بنائی۔ جتنا کُوڑا جلانے کے قابل تھا۔ اُسے جلا دیا۔ اور راکھ اور گھانس پھونس وغیرہ سب کیاری میں کھاد ہونے کے لئے ڈال دیا۔ مٹی اور اینٹوں سے جو پاخانے کی دیوار کا کچھ حصہ گر جانے سے نکلی تھیں ایک گھڑونجی بنائی۔ اور مٹکا گھڑا دھو مانجھ کر اور گیرو پھیر کر نیا کر کے اس پر رکھ دیا +

کیاری بن جانے سے گھر کی خوشنمائی کے ساتھ تھوڑا سا اضافہ گھر والوں کے سلیقہ میں بھی ہوا۔ پہلے مُنہ دھونے کے لئے کوئی جگہ مقرر نہیں تھی۔ اب اختری کو کیاری پر وضو کرتے دیکھ کر سب نے خیال کیا۔ کہ پانی کا سب سے اچھا مصرف یہی ہے! اور

بغیر کسی کے کہے سُنے - یہ مُنہ دھونے کا ٹھکانہ بن گیا - اس کے علاوہ دال چاولوں کا دھوون بھی اس میں پڑتا - اور سارا گھر بالکل صاف سُتھرا اور خشک نظر آتا تھا - اختری نے ایک پیسے میں خطمی خُبازی اور کاسنی کے بیج منگائے تھے - کچھ دھنیاں اور مرچوں کے بیج بوئے تھے - اور دو تین ترکاریوں کے بیج مکان دار کی بیوی نے دئے تھے - ترئی - لوکی - کدو - سیم وغیرہ کی بیلیں نکل آئیں - تو ان کو موقع موقع سے کھپریل اور دیواروں پر چڑھا دیا خطمی کاسنی وغیرہ پھولوں کے درخت تھے - مہینہ ہی بھر میں تیار ہو گئے - اور جاڑوں بھر پھولتے رہے - ترکاریاں بھی خوب ہوئیں - اور ان سے خاصی کفایت ہو گئی - اکثر دال یا گوشت کی جگہ پکتیں - اور اتنے دام بچ رہتے - گھر الگ گلزار معلوم ہوتا - جس طرف نظر پڑتی سبزی ہی سبزی اور پھول ہی پھول نظر آتے - آتی گرمی کچھ پودینہ کی جڑیں لے کر لگا دیں - دو دو تین تین پیسہ میں چھ سات پیڑ گلاب چنبیلی جوئی بیلے وغیرہ کے لے کر لگا دئے - گرمی کی فصل کی ترکاریاں کھیرا ککڑی کریلا بھنڈی کے بیج بو دئے - ترکاریوں سے اتنی کفایت ہوتی تھی - کہ ساس کو یہ چار پانچ آنے کا خرچ ناگوار نہیں ہوا - اور گرمیوں میں بھی ترکاریوں پودینے اور پھولوں کی افراط رہی ؞

خیر یہ تو سب کچھ ہوتا رہا - مگر مالی پریشانیاں برابر رہیں - شادی کو چھ مہینے گزرے تھے - کہ گرمی ختم ہو کر جاڑا آگیا - لیکن یہاں رکھا ہی کیا تھا - جو جاڑاول کا سامان ہوتا - مہینہ بھر کی بے کاری

میں جو قرضہ ہو گیا تھا۔ اُسی کا ادا کرنا ایک پہاڑ تھا۔ کپڑے لتے کا کیا ذکر۔ جاڑا گزرا اور گرمی آئی۔ اب جہیز کے کپڑے بھی ختم ہو چکے تھے۔ اس لئے مجبوراً قرض ادھار کر کے تین جوڑے اس شان کے تیار ہوئے۔ کہ پاجامہ ہے۔ تو دوپٹہ نہیں۔ اور دوپٹہ ہے۔ تو کرتہ نہیں۔ اسی عرصہ میں دوبارہ خاں صاحب نے ملازمت کو استعفا دیا۔ اور اس مرتبہ پورے ڈھائی مہینے انہیں بے کار رہنا پڑا۔ ایسے شخص کے لئے جو روز کنواں کھود کر پانی پیتا ہو۔ ڈھائی ماہ کی بے کاری ایک بلائے عظیم تھی۔ جو کسی طرح کاٹے نہ کٹتی تھی۔ آخر نوبت بہ اینجا رسید کہ برتن بھانڈا رہن رکھ کر پیٹ کا دوزخ بھرا جانے لگا۔

مہینہ بھریوں بھی گزرا پھر آخر زیور کا نمبر آ گیا۔ اختری سب کچھ دیکھتی تھی۔ لیکن مُنہ سے ایک حرف نہیں نکالتی تھی۔ اب جب اس کے زیور کی باری آئی۔ تو دل مضبوط کر کے اس نے میاں سے کہا۔ کہ زیور ہوتا ہی اسی لئے ہے۔ کہ مصیبت کے وقت کام آئے۔ مَیں اسے پہنتی کیا اچھی لگوں گی۔ اگر تم تکلیف میں رہے۔ مگر اتنا ضرور کہوں گی۔ کہ رہن نہ رکھو۔ بلکہ فروخت کر دو۔ کیونکہ قرضہ کی رفتار دیکھ کر بہت عرصہ اس کے چھُٹنے کی اُمید نہیں ہے۔ مہاجن کا سود بڑھتے بڑھتے اگر قرضہ کے برابر ہو گیا۔ تو کیا فائدہ ہو گا۔ دوسرے اس وقت روپے کی بھی زیادہ ضرورت ہے۔ اور رہن رکھنے میں صرف نہائی قیمت ملے گی۔ اس لئے میری صلاح یہ ہے۔ کہ فی الحال پچاس روپے میں تم میری بالیاں فروخت کر دو۔ اور اس روپے سے پُرانے قرضے بھی ادا کر دو۔ اور برتن وغیرہ جو رہن رکھ دئے ہیں۔ سب چھُٹا لو۔ باقی جو بچے گا۔

اس سے گھر کا خرچ چلتا رہے گا۔ جب خدا تمہیں دے گا۔ تو بالیاں پھر بن جائیں گی۔

خاں صاحب شرمندہ تو بہت ہوئے۔ مگر صلاح معقول تھی اس پر عمل کیا۔ اور بیوی کی بدولت قرضے سے سبکدوش ہو گئے۔ اس قصّہ کے ڈیڑھ مہینے بعد بمشکل ملازمت حاصل کی۔ مگر اس مرتبہ صرف بارہ روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ اور بھی زیادہ تنگی ہو گئی۔ مگر خیریت یہ تھی۔ کہ قرضہ کسی کا ایک پیسہ کا بھی نہیں تھا۔ لشتم پشتم گزر ہوتی رہی ماں اب بہت بوڑھی ہو گئی تھیں۔ پھر اس پر سے دائم المریض۔ دوسرے لڑکی بھی اب سیانی تھی۔ ان کو بڑی فکر تھی۔ کہ کسی طرح اپنی زندگی میں اس کے دو بول پڑھا دوں۔ ان کی منجھلی لڑکی کا سوتیلا لڑکا بہت نیک بخت اور کماؤ تھا۔ پہلے تو باپ کے کارچوب کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ مگر اب کچھ عرصہ سے بمبئی جا کر اس نے مستقل طور پر اپنا کارخانہ علیحدہ کھول لیا تھا۔ جو بفضلہ بہت کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا۔ باپ کو اس کے بیاہ کی فکر تھی۔ ایک دن ساس کے پاس آ کر سالی کے لئے پیغام دیا۔ بڑی بی تو نہال ہو گئیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کہنے لگیں "بیٹا میں محمد عمر کو بچپن سے دیکھتی ہوں۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ ماشاء اللہ ایسا نیک بخت اور محنتی بچّہ ہے۔ کہ میرا تو منہ نہیں جو اس کی تعریف کروں۔ مگر تم جانتے ہو میرے پاس دینے لینے کو کچھ نہیں رکھا ہے۔ یہ گوشت کا لوتھڑا حاضر ہے۔ تمہیں منظور ہے۔ تو جس دن چاہو آؤ اپنے گھر کے کپڑے پہناؤ۔ اور دو بول پڑھا کے لے جاؤ"۔

بھائیوں نے بھی پسند کیا۔ اور اسی مہینے کے اندر بڑی بی اس

بھاری فکر سے سبکدوش ہوگئیں۔ دو چار برتن اور ایک آدھ زیور ماں نے برسوں سے اس کے نام کے سینت رکھے تھے۔ عین وقت پر کچھ لڑکی کے ماموؤں نے مدد کی ایک ایک جوڑا تینوں بہنوں نے دیا۔ دس دس پانچ پانچ بھابیوں نے لگائے۔ غرض کسی نہ کسی طرح یہ پتھر بھی سرک ہی گیا۔ اختری کی شادی کو دو ہی برس گزرے تھے۔ کہ اتنے عرصہ میں میاں نے تین مرتبہ ملازمت کو طلاق دی۔ اور اُن منحوس دنوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے بیوی کا تمام زیور کھا بیٹھے لگ گیا۔ یہاں تک کہ اب اس غریب کے پاس ایک تار تک باقی نہیں رہا۔

عزم بالجزم

پھوپی کبھی بھتیجی کو بلاتیں۔ یا خود دیکھنے کو آنکلتیں۔ تو اس کی مصیبت پر آٹھ آٹھ آنسو روتیں۔ کہ "ہائے یہ اس کے پہننے اوڑھنے کے دن۔ اور یہ ہر چیز سے اپنا دل مارے بیٹھی ہے۔ زیور کے نام سے ایک تانبے کا تار بدن پر نہیں۔ کپڑے دیکھو تو پھٹے پُرانے وہ بھی زمین کی رنگت ہو رہے ہیں۔ جس دن سے بیاہ ہوا میری بچی کو جاڑوں میں کبھی ایک رضائی اور مرزئی بھی نصیب نہ ہوئی۔ مہاوٹ کی سردی اور چلّے کے جاڑوں میں بھی جب دیکھا پیٹ میں گھٹنے دبئے سکڑتے ہی پایا۔ کیا کروں میرے پاس اتنا ہے نہیں۔ ماں کا بڑھاپا ہے۔ وہ روز کی بیمار ہیں۔ ان کی خدمت سے جتنا وقت بچتا ہے۔ اس میں چار پیسے کا دُکھڑا کر لیتی ہوں۔ اس میں دُنیا بھر کے خرچ ہیں۔ پیسہ دھیلا دوا درمن میں بھی اُٹھتا ہی ہے۔ ایک عورت کے ہاتھ کی محنت وہ بھی نِھکلے وقت کی کہاں تک دو آدمیوں کی پوری ڈال سکتی ہے۔ بہتیرا پھڑ پھڑاتی ہوں۔ کہ اپنی بچی کو ایک آدھ کپڑا میں ہی بنا دیا کروں۔ مگر بن ہی نہیں پڑتا۔ ہائے اس وقت آنکھوں پر کیسے پردے پڑ گئے تھے۔ کتنا ہی لوگوں نے سمجھایا۔ مگر میری خاک سمجھ میں نہ آیا۔ اور اپنے ہاتھ سے اپنی بچی کا بدا پھوڑ دیا"۔

صابر و شاکر اختری کبھی ان کے اس ماتم میں شریک نہ ہوتی۔ بلکہ نہایت متانت کے ساتھ سمجھاتی۔ کہ "پھوپی جو کچھ میری تقدیر کا لکھا تھا وہ پورا ہوا۔ اگر میں عیش و راحت کے لئے دُنیا میں آئی ہوتی۔ تو بچپن ہی میں ماں کا سایہ کیوں میرے سر سے اُٹھ جاتا۔ اور کیوں ابا جان میری طرف سے آنکھیں پھیر لیتے۔ جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔ یہ سب نوشتہ تقدیر ہے۔ کسی کی اس میں کوئی خطا نہیں۔ اب اس کا ماتم کر کے اپنا فضیحتہ کرنا مفت میں لوگوں کو اپنے اُوپر ہنسوانا ہے۔ جب میں اپنے دل پر میل نہیں آنے دیتی۔ تو تم کیوں ناحق رنج کرتی ہو"۔

یہ تو سب کچھ وہ زبان سے کہتی اور حتی الامکان اپنی شفیق پھوپی کو تسلّی دینے کی کوشش کرتی۔ لیکن در اصل یہ فکر اُسے رات دن چین نہ لینے دیتی تھی۔ کہ اب تک تو خیر زیور نے ساتھ دیا۔ آئندہ آخر کیا ہوگا۔ آخر کار اس نتیجہ پر پہنچی۔ کہ "مجھے بھی اپنے ہاتھ پیر چلا کر کچھ نہ کچھ پیدا کرنا چاہئے۔ مثل ہے۔ کہ ہمت کا حامی خدا ہے۔ ایک بار اپنی سی کوشش تو کر لوں۔ شاید اسی طرح میری بگڑی ہوئی تقدیر سنبھل جائے"۔

یہ سوچ کر اس نے بظاہر بیکاری سے بچنے اور دل بہلانے کے حیلے سے اپنی نند سے گوٹا بُننا سیکھا۔ دو تین مہینے بعد جب اچھی طرح مشق ہو گئی۔ اور روزانہ چار ساڑھے چار آنے کا بُننے لگی۔ تو ایک مہینے کی آمدنی پورے آٹھ روپے اکٹھے کر کے ساس کے آگے لا کر رکھ دئے۔ وہ دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ اور ہزاروں دعائیں دے کر کہنے لگیں۔ کہ "بیٹی تمہاری محنت کا پیسہ ہے۔ تم اپنے ہی پاس

رکھو۔ اور اپنے شوق کی جہیز چاہو منگاؤ۔ ہمیں خدا نے اس قابل نہیں کیا۔ کہ تمہارے ارمان پورے کرسکیں۔ تو خدا تم کو اپنی محنت ہی سے اتنا دے۔" مگر جب اس نے زیادہ اصرار کیا۔ تو ساس نے روپے اُٹھا کر رکھ لئے۔ اور دوسرے دن بیٹے سے بہو کے لئے چار جوڑوں کا کپڑا منگا دیا۔

دوسرے مہینے کی آمدنی میں اس نے ساس کے لئے کپڑے بنائے اور اب کی مرتبہ بجائے روپے کے چار جوڑے سی پرو کر ساس کے آگے لاکر رکھ دئے۔ بڑی بی بہو کی سعادت مندی سے باغ باغ ہوگئیں مگر ساتھ ہی بیٹے کے خیال سے افسردہ ہوکر بولیں۔ میری بچی دھن بھاگ اس ساس کے جس کو تم سی بہو نصیب ہو۔ مگر بیٹی میرے لئے تو تمہاری اور تمہارے میاں کی اترن بھی کافی ہے۔ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کے چار دن پورے کر ہی لوں گی۔ نیا ہو تو اور پرانا ہو تو تن ڈھانکنے سے کام ہے۔ ایسا ہی تھا تو تم نے میاں کے کپڑے بنا دیئے ہوتے۔ وہ مرد صورت باہر کا آنے جانے والا اور حالت یہ ہے۔ کہ پاجامے میں پیوندوں کی جگہ بھی تو نہیں رہی"

اختری نے شرمندہ ہوکر گردن جھکالی۔ اور آہستہ سے یہ کہہ کر چلی آئی۔ کہ اس مہینے میں انشاءاللہ سب کے کپڑے پورے ہو جائیں گے۔ چنانچہ اب کی مرتبہ اس نے نندوئی سے آٹھ گز لٹھا تین روپے آٹھ آنے کا اور ڈھائی روپے کی آٹھ گز تن زیب کرتے پاجاموں کے لئے منگائی اور چھ چھ آنے میں دو واسکٹیں کٹ پیس کی سلی سلائی خرید لیں۔ سوا روپے میں ایک مخمل کی حامد کیپ[1] منگالی۔

[1] مخمل کی کشتی نما ٹوپی

اور سب کپڑے تیار کر کے گٹھری ساس کے آگے یہ کہتے ہوئے رکھ دی "لیجئے اماں جان۔ اب تو آپ خوش ہوئیں"۔

بڑی بی نے اُسے گلے سے لگا کر کہا "بیٹی مجھے خُدا اُس دن کو نہ رکھے۔ کہ تم سی پیاری بہو سے ناراض ہوں۔ میں نے تو ایک بات کہہ دی تھی۔ خدانخواستہ تم سے ناخوش کیوں ہونے لگی تھی"۔

خاں صاحب نے کپڑے دیکھے۔ جتنی خوشی ہوئی اس سے زیادہ شرمندگی۔ جی میں آیا۔ کہ پہننے سے انکار کر دیں۔ مگر محبت شعار بیوی کی دل شکنی کے خیال سے ایسا نہیں کیا۔ چوتھے مہینے میں سب کی جوتیاں منگانے کا ارادہ کر ہی رہی تھی۔ کہ یکایک بڑی بی نے ہیضہ کیا۔ اختری نے دو مرتبہ ڈاکٹر کو بُلا کر دکھایا۔ اور بہو بیٹے دونوں نے جتنی جتنی دوڑ دھوپ کر سکتے تھے کی۔ مگر پیغام اجل آ چکا تھا۔ ایک رات میں بے چاری ختم ہوگئیں۔ مرتے وقت بہو کو بُلا کر شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور آبدیدہ ہو کر کہنے لگیں۔ کہ "پیاری بیٹی تم نے اس دو سوا دو برس کے عرصے میں جتنی میری خدمت کی ہے۔ میرا مُنہ نہیں۔ کہ تمہاری تعریف کر سکوں۔ جیسا تم نے میرا دل خوش رکھا میرے رُوئیں رُوئیں سے تمہارے لئے دُعا نکلتی ہے۔ میرا تمہارا اتنے ہی دنوں کا ساتھ تھا۔ اب میں رخصت ہوتی ہوں۔ مگر میری دلی دعائیں ہر وقت تمہارے ساتھ ہیں۔ اور انشاءاللہ تم دونوں جہان میں اپنی نیکیوں کا بدلہ پاؤ گی"۔

اختری کو بھی ایسی چاہنے والی ساس کا بہت صدمہ ہوا۔ اس وجہ سے اَور بھی زیادہ کہ پہلے ہی اس کا دل رنجور اور غم رسیدہ تھا

لیکن حکم قضاء و قدر سے کسی کو چارہ نہیں۔ اب سب سے بڑی فکر اُسے یہ تھی کہ اُن کے کفن دفن اور رسوم فاتحہ خوانی کے لئے کیا سامان کیا جائے۔ کوئی زیور بھی باقی نہ تھا۔ جو میاں کے حوالے کرتی۔ میاں خود سخت پریشان تھے۔ کہ قرض لیں تو کس سے۔ اور دے گا کوئی کس برتے پر۔ آخر اس مشکل کو بھی اسی نے حل کیا۔ اور بڑی نند سے چپکے سے کہا۔ کہ اگر اس وقت چوبیس روپے دے دیجئے۔ تو بڑی مہربانی ہو گی۔ آپ کے بھائی سے اس روپے سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں لے رہی ہوں۔ اور انشاء اللہ تین مہینے میں مَیں ہی ادا کر دوں گی۔ اور اگر آپ کو اطمینان نہ ہو۔ تو برتن رکھ لیجئے۔

نند نے کہا۔ "دلھن تمہاری بھی کیا باتیں ہیں۔ بھلا میں اور تمہارا اعتبار نہ کروں گی"۔ اسی وقت چوبیس روپے نکال کر حوالے کئے۔ دس روپے میں کفن دفن کا سامان ہوا۔ چار روپے میں تیجا۔ میلاد شریف اور مہمان داری۔ تیجے کے دن اختری نے وہ چاروں جوڑے کپڑے (جن کو ابھی بے چاری بڑی بی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔) اور دس روپے لا کر نندوں کے آگے رکھ دیئے۔ کہ اس وقت تو صرف یہ سامان اماں جان کے نام پر دینے کو میرے پاس ہے۔ اگر آپ سب کی مرضی ہو۔ تو کھانا پکوا کر اور تاریخیں مقرر کر کے دسویں بیسویں چالیسویں پر ایک ایک جوڑا دے دوں۔ ورنہ میری تو یہ مرضی ہے۔ کہ یہ سب ایک دم یتیم خانے میں بھیج دوں۔ کپڑے لڑکیوں کے کام آجائیں گے۔ اور روپیہ واجبی ضرورتوں میں صرف ہو جائے گا۔ ہم نے اگر ایک دن پلاؤ زردہ پکا کر کُنبے بھر کی دعوت کر دی۔ تو اس سے ذرا سی دیر کی واہ واہ تو ضرور ہو جائیگی

مگر اصلی غرض جو میت کو ثواب پہنچانا ہے۔ وہ فوت ہو جائے گی۔ وہی مثل ہو گی گدھے کا کھایا پُن نہ پاپ۔ یتیموں کی خدمت سے بڑھ کر کوئی کام ثواب کا نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا فاتحہ کا ثواب تو اس کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ہر شخص ہر وقت پہنچا سکتا ہے۔ آیندہ جیسی آپ سب کی رائے ہو میں اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں"۔

نندیں اگرچہ جاہل تھیں۔ اور اُن سے اُمید نہ تھی۔ کہ آسانی سے اس مشورہ کو قبول کر لیں گی۔ لیکن اوّل تو انہیں بھائی کی حالت کو دیکھتے ہوئے اُمید نہیں تھی۔ کہ بھاوج اتنا کر سکے گی۔ دوسرے یہ کہ بھاوج پڑھی لکھی تھی۔ اس لئے اس کی رائے کی ایک خاص وقعت تھی۔ خصوصاً مسئلے مسائل کی بابت۔ پھر بھی تھوڑا بہت اختلاف ضرور تھا۔ وہ اس طرح رفع ہؤا۔ کہ پاس ہی ایک دیوبندی مولوی صاحب رہتے تھے۔ اور یہ سارا خاندان ان کا بہت معتقد تھا۔ اُن کے سامنے دونوں صورتیں پیش کی گئیں۔ اختری بیگم کی رائے کو انہوں نے بھی پسند کیا۔ اور اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ کہ "خوش نصیب ہیں وہ گھرانے جن میں ایسی عورتیں پیدا ہوں۔ مسلمانوں کی رسم پرستی اور شرک و بدعت کے گناہ کا باعث زیادہ تر عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ آج اگر ہماری عورتیں ان رسوم کی بیخ کنی پر آمادہ ہو جائیں۔ تو ہماری قوم بہت سے گناہوں اور تباہیوں سے بچ سکتی ہے"۔ غرض اس طرح یہ مہم بھی آسانی سے سر ہو گئی۔ اور تیجے کی صبح کو سب لوگ یعنی بڑی بی کی بیٹیاں نواسیاں بڑی بہو اور بیٹا سب اپنے اپنے گھر رخصت ہوتے۔

اختری کو اس بات کی ضرور خوشی ہوئی۔ کہ اس کے ہاتھوں دسویں بیسویں چالیسویں وغیرہ کی فضول اور تباہ کن رسوم کا خاتمہ ہو گیا۔ اگر اس کا بس چلتا۔ تو تیجا بھی نہ کرتی۔ مگر دقت یہ تھی۔ کہ یہ تیسرے ہی دن ہوا کرتا ہے۔ اتنے کم عرصے میں اس جاہل خاندان کو ایسی زبردست رسم کے اُٹھانے پر (جو سنت بلکہ فرض سے بھی زیادہ ضروری سمجھی جاتی ہے۔) راضی کر لینا آسان کام نہ تھا۔ اس لئے اختری نے سوتی بھڑوں کو چھیڑ کر موت کے گھر میں فساد پیدا کرنا مناسب نہ سمجھا اور چُپ چاپ تیجا کر دیا *

~~~~~~~~~~✻~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~

خاں صاحب کا سفر

خاں صاحب کے دل میں بیوی کی خوبیاں دن بدن زیادہ گھر کرتی جاتی تھیں۔ خصوصاً اس موقع پر جس طرح اس نے ان کو پریشانی اور زیر باری سے بچایا تھا۔ وہ دل سے اس کے معترف تھے۔ اور بار بار اپنی تلون مزاجی پر لعنت بھیجتے تھے۔ جس کی بدولت آئے دن اس نیک بیوی کو مصیبت کا سامنا رہتا تھا۔ اور بار بار دل میں عہد کرتے تھے۔ کہ اب کبھی ایسی حرکت نہ کریں گے۔ بڑی بی کے انتقال کو دو مہینے گزر گئے۔ اور اختری بیگم بدستور اپنے کام میں مصروف رہیں۔ اب خرچ بھی صرف دو آدمیوں کا رہ گیا تھا۔ اختری قرض کے بوجھ سے سخت گھبراتی تھی۔ اس لئے اُس نے جس طرح بنا دو مہینے صرف گیارہ گیارہ روپے میں گھر کا خرچ پورا کیا۔ اور چار میاں کی تنخواہ میں سے بچاتے اور آٹھ اپنے ملا کر بارہ بارہ روپے مہینا دے کر بجائے تین کے دو ہی مہینے میں قرضہ ادا کر دیا۔ لیکن ابھی قرضے سے نجات حاصل کر کے اطمینان کا سانس بھی نہ لینے پائی تھی۔ کہ خاں صاحب کو اپنی ملازمت کے سلسلے میں تین مہینے کے لئے پردیس جانے کی ضرورت پیش آئی۔ اور چونکہ ستمبر کا مہینہ تھا۔ سردی کا موسم بہت قریب آ گیا تھا۔ پردیس جانے کے لئے سرمائی لباس اور اوڑھنے بچھونے کی سخت ضرورت

تھی۔ جس کا مہیا کرنا جتنا ضروری تھا اتنا ہی تنگدستی کی وجہ سے مشکل بھی تھا۔ خاں صاحب نے اتنا تو کیا۔ کہ ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی لے لی۔ اور بیوی کو دے کر کہا۔ کہ اس میں سے پانچ روپے کا جو سامان میرے سفر کے لئے مناسب سمجھو منگا لو۔ پانچ اپنے خرچ کے لئے رہنے دینا۔ اور پانچ میں لیتا جاؤں گا۔

مگر اس میں بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ جبکہ لباس سے لے کر اوڑھنا بچھونا تک نیا تیار کرنا تھا۔ مجبوراً دوبارہ اُسے قرض لینا پڑا۔ نند کا روپیہ چونکہ وعدے سے پہلے ہی ادا کر چکی تھی۔ اس لئے دوبارہ بھی انہیں سے مانگنے کی ہمت ہوئی۔ اور پہلے تجربے کی بنا پر انہوں نے آسانی سے دے بھی دیا۔ چنانچہ اب کے اس نے پندرہ روپے لے کر اپنے ہاتھ میں پورے پینتالیس روپے جمع کر لئے۔ جس میں سے پندرہ تو میاں کے سفر خرچ کے لئے الگ کر لئے۔ باقی تیس میں ایک لحاف کا ابرا چھپا چھپایا تین روپے میں خرید لیا۔ ایک روپیہ چھ آنے کا استر آیا اور دو آنے کی پُڑیا میں رنگا گیا۔ گوٹ کے لئے نو آنے کا ڈیڑھ گز پرمٹا منگا لیا۔ تین روپے کی تین سیر روئی منگائی۔ اور نو آنے بھرائی دے کر آٹھ روپے میں لحاف تیار کیا۔ تو شک پُرانے لحافوں کی بنائی۔ پُرانے لحاف کیا تھے۔ دونوں ماں بیٹیوں کی دو رضائیاں کوئی سیر سیر بھر روئی کی تھیں جن کا استر تو پُرانا ہو کر بالکل بے کار ہو گیا تھا۔ البتہ ابروں میں کچھ جان باقی تھی۔ انہیں کو اُدھیڑ کر دھو لیا۔ اور پھٹے ہوئے حصے علیحدہ کر کے پکا رنگ کر تو شک سی لی۔ اور وہی پُرانی روئی اس میں بھر دی تین روپے کی دو چادریں منگا لیں۔ اور پونے پانچ آنے گز کا دو گز

تین سکہ منگا کر تکیہ کے دو جھالر دار غلاف تیار کر لئے۔ اس طرح بارہ روپے ساڑھے تین آنے میں اوڑھنے بچھونے کی طرف سے تو بے فکری ہوئی۔ ابھی پہننے کے کپڑوں کی فکر باقی تھی۔ اس کے لئے ڈیڑھ روپے گز کا پونے تین گز کشمیرہ چار روپے دو آنے کا اور استر کا کپڑا ایک روپیہ چار آنے کا آیا۔ آٹھ آنے کا بکرم وغیرہ اور دو روپے سلائی کے دے کر سات روپے چودہ آنے میں کوٹ بھی تیار ہو گیا۔ روئی کی مرزئی کے لئے سوا گز چھینٹ ساڑھے بارہ آنے کی آئی۔ چھ آنے کا استر اور تین آنے میں روئی کی قیمت اور بھرائی دے کر ایک روپیہ ساڑھے پانچ آنے میں وہ بھی ہو گئی۔ ایک روپے کا گلوبند اور تین روپے کا جوتا آیا۔ اس طرح پچیس روپے سات آنے میں یہ سب سامان تیار ہوا۔

خاں صاحب کو فکر ہوئی۔ کہ بیوی کو اتنے عرصہ کے لئے بالکل تنہا کس طرح چھوڑیں۔ اب تک اوّل تو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اور اگر کبھی کسی ضرورت سے دو چار دن کو کہیں گئے بھی۔ تو اپنی والدہ مرحومہ کے بھروسے پر بے فکر رہتے تھے۔ آخر بیوی کے مشورے سے یہ طے ہوا۔ کہ اتنے عرصہ کے لئے انہیں میکے بھیجدیا جائے۔ چنانچہ یکم اکتوبر کو مع بیوی اور اسباب کے سسرال چلے گئے۔ اور دوسرے دن وہیں سے پردیس سدھارے۔ کپڑے تیار کرنے کے بعد صرف چار روپے نو آنے اختری بیگم کے پاس باقی تھے۔ اس میں سے ڈیڑھ روپیہ اسباب کی ڈھلائی۔ سواری کے کرائے۔ اور ناشتے میں خرچ ہو گیا۔ صرف تین اس کے پاس بچ رہے تھے۔ چلتے وقت اس نے بڑے اصرار کے ساتھ پندرہ روپے خاں صاحب

کے حوالے کر دیتے۔ ہزار انہوں نے کہا۔ کہ اس میں سے کم ازکم سات تو تم لے لو۔ آخر ابھی پورا مہینہ پڑا ہوا ہے۔ کس طرح کام چلے گا۔ مگر اس نے یہی کہا۔ کہ میری تم کچھ فکر نہ کرو۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنی گزر کر ہی لوں گی۔ پردیس میں انسان کو اپنی گرہ مضبوط رکھنی چاہیئے۔ معلوم نہیں کیا اتفاق ہو۔ خدا تمہیں ساتھ خیر کے واپس لائے"۔

خاں صاحب دل ہی دل میں بیوی کے سلیقے ہمت اور حوصلے کی داد دیتے ہوئے رخصت ہوئے۔

خاں صاحب کی روانگی کے بعد جو تین روپے باقی تھے۔ اس میں سے دو روپے لے جا کر پھوپی کے حوالے کئے۔ صرف ایک روپیہ اپنی متفرق ضرورتوں مثلاً دھلائی تیل صابن کارڈ لفافے وغیرہ کے لئے رکھ لیا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی۔ کہ اپنا ایک دن کا بار بھی وہ غریب پھوپی کے سر ڈالے۔ ہزار انہوں نے نہیں نہیں کی۔ اور کہا۔ کہ بیٹیا آخر میں کبھی کبھی دس پندرہ دن کو بلا کر تمہیں اپنے پاس رکھتی ہوں۔ تو آخر کھلاتی ہوں یا نہیں؟ یہ آخر کیا ہے کہ اب کی تم نے آتے ہی خرچ کی فکر کی۔ لیکن اختری نے بصد منت وسماجت انہیں راضی کر لیا۔ اور یہی کہا۔ کہ آپ کا بلانا دوسری بات ہے۔ لیکن اس وقت تو میں اپنی ضرورت سے آئی ہوں۔ آپ کو ناحق کیوں زیر بار کروں۔

~~~~~~✱~~~~~~
~~~~~~
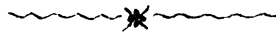
رہبر کامل

ان سب کاموں سے فرصت پا کر اختری نے سوچا۔ کہ لاؤ آج کے دن سب سے مل جُل لوں۔ کل سے اطمینان سے کام کر گوٹا بُننا شروع کر دوں گی۔ (بغیر اس کے گزارہ کی کوئی صورت نہ تھی۔ اور قرضہ بھی ادا کرنا تھا) یہ سوچ کر وہ سب سے پہلے اپنی اُستانی صاحبہ کے پاس پہنچی۔ وہ بیچاری نہایت رحم دل واقع ہوئی تھیں۔ اور اختری سے شاگردی کے رشتے سے بہت ہی محبت کرتی تھیں۔ ہمیشہ اس کے حالات سُن سُن کر کُڑھتی رہتی تھیں۔ دیکھتے ہی گلے سے لگا لیا۔ اور اس کی حالت پر افسوس کرنے لگیں۔ دیر تک جب وہ اظہار ہمدردی کر چکیں۔ تو اختری نے کہا۔ اُستانی جی یہ آپ کی محبت ہے۔ کہ میرے لئے اس طرح کڑھتی ہیں۔ مگر یہ تو سب تقدیری باتیں ہیں۔ اگر میں شروع سے بُری تقدیر لیکر دُنیا میں نہ آئی ہوتی۔ تو کیوں میرے لئے ہر بات اُلٹی پڑتی۔ اب جو کچھ ہو گزرا۔ اس کے لئے افسوس کرنا بے کار ہے۔ البتہ ان تدابیر پر غور کرنا چاہیئے۔ جن سے میری زندگی خوشگوار بن سکے۔ میں نے بہت دنوں اس مضمون پر غور کیا ہے۔ اور آخر اس نتیجے پر پہنچی ہوں۔ کہ مجھے اپنی بہتری اور بہبودی کے لئے دوسروں ہی کا سہارا نہیں تکنا چاہیئے۔ بلکہ اپنے بل بوتے پر بھی کچھ کرنا چاہیئے۔ مگر افسوس کہ

نہ میری تعلیم ہی اتنی ہوئی ہے۔ کہ اس سے کچھ فائدہ اُٹھا سکوں۔ نہ کوئی خاص ہُنر مجھے آتا ہے۔ آخر مجبور ہو کر گوٹا بننا سیکھا۔ اور خدا کا شکر ہے۔ کہ کئی مہینے سے اس میں آٹھ روپے ماہوار پیدا کر لیتی ہوں۔ آپ میری اُستانی ہیں۔ اور جو محبت اور شفقت میرے حال پر فرماتی ہیں۔ اس کو دیکھتے ہوئے مجھے اُمید ہے۔ کہ میری زندگی کو سدھارنے کے لئے اپنے مفید اور قیمتی مشورہ سے میری امداد فرمائیں گی۔ یہ تو اب میں مصمم ارادہ کر چکی ہوں۔ کہ بے کار ہرگز نہ بیٹھوں گی۔ اور اپنے ہاتھ پیر اور دماغ کی مدد سے جو کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ ضرور کروں گی۔ لیکن کیا کروں۔ اور کس طریقہ سے کروں۔ کہ اپنی محنت کا کافی معاوضہ حاصل کر سکوں۔ اس کو آپ مجھ سے بہتر سمجھ سکتی ہیں۔ اور اسی کے لئے میں آپ کے قیمتی مشورے کی متمنّی ہوں"۔

اختری کی تقریر سُن کر فرطِ مسرت اور تعجب سے اُستانی جی آبدیدہ ہو گئیں۔ اور دوبارہ اپنی شاگرد کو گلے سے لگا کر فرمایا "اختری تم ہرگز بدقسمت نہیں ہو۔ دُنیا میں جو شخص ہمت اور محنت سے کام لیتا ہے۔ وہ ایک نہ ایک دن ضرور اپنی مراد حاصل کر لیتا ہے۔ اور جتنے بڑے لوگ دُنیا میں ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی پر غور کرو تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ شروع شروع میں ہمیشہ ان کو ناکامیوں اور مایوسیوں کا مُنہ دیکھنا پڑا ہے۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اور آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ ہمّت اور محنت عجیب چیز ہے۔ جس نے ہمت کا دامن پکڑ لیا۔ وہ کبھی ناکام نہیں رہ سکتا ؎

مثل ہے۔ کہ ہمّت کا حامی خدا ہے
چھپا دستِ ہمّت میں زورِ قضا ہے

مجھے تمہارے خیالات معلوم ہو کر بہت خوشی ہوئی۔ افسوس ہے۔
کہ میں خود کسی قابل نہیں۔ لیکن جو کچھ بھی تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔
اس سے کبھی دریغ نہ کروں گی۔ میں اکثر اس بات پر غور کیا کرتی ہوں
کہ ہمارے ملک میں جیسی عورتوں کی ناقدری ہے۔ اور کہیں نہیں۔
یہاں تک کہ عورت کو اُس کی محنت کا معاوضہ بھی اتنا کم ملتا ہے۔
کہ مرد کے مقابلے میں آٹھواں حصّہ بھی نہیں ہوتا۔ دُور کیوں جاؤ۔
گھریلو سینے والی عورتوں اور درزیوں ہی کو دیکھ لو۔ عورت نے اگر
دن بھر سلائی کی۔ تو شام کو زیادہ سے زیادہ چار آنے اُجرت کے
اس کے پلّے پڑیں گے۔ لیکن درزی انہیں بارہ گھنٹوں میں دو چار
سے لے کر دس روپے تک پیدا کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ عورت
کرتا پاجامہ سیتی ہے۔ اور درزی سوٹ تیار کرتا ہے۔ لیکن محنت
تو عورت کی بھی آخر اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ہاتھ
سے کام کرتی ہے۔ اور درزی مشین سے۔ کسی خدا کے بندے کے دل
میں یہ خیال کبھی نہیں آتا۔ کہ یہ ہزاروں مصیبت ماریاں جو کتنی
کتنی بچّوں کو لے کر بیوہ ہوئی ہیں۔ اور جن کی گزر اوقات صرف سوئی
کے سہارے پر ہے۔ ان کو نئے فیشن کے کپڑوں کی قطع بُرید میں اتنا
ماہر کر دیا جائے۔ کہ کم از کم وہ اسی کام میں اپنی زندگی فراغت سے
بسر کر سکیں۔ بڑے بڑے شہروں میں ایک ایک سلائی خانہ اس قسم
کا کھول دینا۔ کہ اس میں ضرورت مند بہنیں کام سیکھ سکیں۔ اور سیکھ
چکنے کے بعد انہیں سند کے ساتھ ایک ایک مشین قسط پر دے دینا ہمارے
لیڈروں کے لئے کچھ مشکل کام نہیں ہے۔ مگر یہاں تو لیڈروں کے رنگ

ہی کچھ اَور ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوکر دھواں دھار تقریریں کرنا۔ اور قوم کا مرثیہ پڑھنا۔ اور اپنی مفلس قوم کے مصیبت کے پیسے سے فرسٹ کلاس میں سوار ہوکر تمام ہندوستان کا دورہ کرنا۔ بلکہ اگر ممکن ہو۔ تو یورپ تک کی سیاحت فرمانا۔ اور ہمیشہ پلاؤ قورمہ پر ہاتھ مارنا۔ بس یہی لوازمات لیڈری ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے یہ کر لیا۔ تو گویا لیڈری کے فرائض بطریق احسن ادا کر دیئے۔

خیر اب اس کا رونا کہاں تک روؤں۔ مختصر یہ ہے۔ کہ میں نے انہیں سب باتوں پر غور کرکے یہ سوچا۔ کہ جس طرح بھی ممکن ہو۔ میں انگریزی کپڑوں کی کاٹ چھانٹ سیکھوں۔ اور اپنی دوسری بہنوں کو سکھانے کی کوشش کروں گی۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے اشتہار میں تعریف دیکھ کر کتاب "رسالہ فن خیاطی" منگائی۔ اور اس کی مدد سے کئی کپڑوں کی قطع برید سیکھی۔ مگر افسوس کہ اس کا دوسرا حصہ پہلے حصے کی ناقدری کی وجہ سے طبع نہ ہو سکا۔ جس سے اس کی تعلیم مکمل ہوئی۔ مجبور ہو کر میں نے باقی کام سیکھنے کے لئے پرانے کپڑوں کو ادھیڑ ادھیڑ کر اور ان کے مطابق خاکے بنا بنا کر ہر قسم کے کپڑے تیار کئے۔ اور خدا کا شکر ہے۔ اس طریقے سے مجھے بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ اب میں خدا کی عنایت سے ہر قسم کے کپڑے بے تکلف قطع کرتی۔ اور سیتی ہوں۔ اور اکثر لوگوں نے میرے تیار کئے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر تعریف اور تعجب کیا ہے۔ اگر تم ہمت کرتی ہو۔ تو میں سر آنکھوں سے تمہیں کام سکھانے کو تیار ہوں۔ مشین بالفعل میری موجود ہے۔ اور سیکھنے کے لئے یہ کافی ہے۔ جب تم

خدا کی عنایت سے پورا کام سیکھ لوگی۔ اور اسے کرنا بھی چاہو گی۔ تو قسط پر مشین خرید لینا"۔

یہ کہہ کر اُستانی جی اُٹھیں۔ اور اپنے بھائی کے گرم کپڑوں کا بکس کھول کر اس میں سے شروانیاں۔ چسٹر اور کئی طرح کے سوٹ وغیرہ نکال کر اختری کے آگے رکھ دئے۔ اور کہا " دیکھو یہ سب کپڑے میرے ہاتھ کے ہیں۔ درزی کو دکھا کر اجرت پوچھی۔ تو اس نے ایک ایک کپڑے کی دو سے لے کر دس روپے تک بتائی"۔

اختری دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اور بولی۔ کہ اُستانی جی میں اس کام کے سیکھنے کے لئے بہت خوشی سے تیار ہوں۔ مگر فکر یہ ہے۔ کہ مشق کس طرح کروں گی۔ اور جب تک مشق کروں گی۔ اس وقت تک کس طرح گزر ہوگی۔ کیونکہ اس کے سیکھنے میں بھی نہ معلوم کتنا عرصہ لگے گا۔

اُستانی جی نے کہا "اس کی تم کچھ فکر نہ کرو۔ میں اپنی معرفت اُجرت پر سینے کے لئے کپڑے منگاؤں گی۔ اور اپنی نگرانی میں تم سے اس طرح تیار کراؤں گی۔ کہ خراب نہ ہونے پائیں۔ اور اُجرت جو کچھ ملے گی۔ اس سے تم اپنا کام چلانا۔ زیادہ سے زیادہ تین مہینے تمہیں میری مدد کی ضرورت ہوگی۔ پھر خدا نے چاہا تم سب کام خود کرنے لگو گی۔ البتہ مشین چلانا۔ اور کاج وغیرہ بنانا ایسا کام ہے۔ جس کے لئے تمہیں کئی دن مشق کرنی پڑے گی۔ اور اس میں جتنے دن صرف ہوں گے۔ وہ ضرور اُجرت سے خالی ہوں گے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ میں خدا نے چاہا تم یہ سیکھ لوگی۔ بس پھر میں

سلائی کے کپڑے منگلنے شروع کردوں گی۔ اگر اس کام پر آمادہ ہو۔ تو کل صبح سے میرے پاس آنا شروع کردو"۔

اختری کو اس سے بڑھ کر اور کیا تھا؟ اندھا کیا چاہیے دو آنکھیں۔ اُستانی جی کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اور سلام کرکے رخصت ہوئی۔ رات کو پلنگ پر لیٹ کر بڑی دیر تک انہیں خیالات میں غلطاں و پیچاں رہی۔ آخرکار اپنے خیالات کو یکسو اور ارادے کو مستحکم کرکے سوگئی۔ صبح اندھیرے سے اُٹھ کر وضو کیا۔ نماز ادا کی۔ اور ایک پارہ کی تلاوت کرکے گھر میں جھاڑو دی۔ اس عرصے میں دن نکل آیا تھا۔ اور اختری بیگم جس طرح کوارپنے میں پڑھنے جایا کرتی تھیں۔ آج بھی اسی اپنے پُرانے مکتب میں جا پہنچیں۔ اُستانی جی کو سلام کیا۔ وہ مسکرا کر اٹھیں۔ اور کہا۔ "آؤ صحنچی میں مشین رکھی ہے۔ وہیں چل کر سبق دیئے دیتی ہوں"۔

یہ کہہ کر ایک نادیل مارک گولہ لئے ہوئے آئیں۔ اختری بیگم کو دکھا کر بابن نکالی۔ اور اس میں ڈورا بھرا۔ پھر اُوپر نیچے ڈورا لگا کر ایک دھجی پر ذرا سا بخیہ کرکے مشین اختری کے حوالے کی۔ کہ لو اس طرح بخیہ کرتی چلو۔ آدھے گھنٹہ تک برابر سامنے بیٹھی رہیں۔ مشین کبھی اُلٹی چلی۔ کبھی سیدھی۔ کبھی اُوپر کا ڈورا کٹا۔ کبھی نیچے کا۔ یہ برابر دیکھتی اور اختری کے اپنے ہاتھ سے درست کراتی ہیں۔ جب سب اچھی طرح اُس کی سمجھ میں آگیا تو ایک پُرانی چادر دے کر کہا۔ کہ لو آج دن بھر تم اس کی دھجیاں پھاڑ پھاڑ کر ان پر بخیہ کرو۔ کیونکہ کتنا ہی میں سمجھاؤں بخیہ بغیر مشق کے ٹھیک نہیں ہو سکتا۔

اور اگر سلائی کے کپڑوں پر مشق کرو گی۔ تو وہ خراب بھی ہوں گے۔
اور دیر بھی بہت لگے گی۔ لیکن اگر آج تم نے دن بھر ان دھجیوں پر
مشق کر لی۔ اور شام تک یہ گولہ ختم کر لیا۔ تو خدا نے چاہا بالکل صاف
اور سیدھا بخیہ کرنے لگو گی"۔

اس کے بعد اُستانی صاحبہ اپنے مکتب میں چلی گئیں۔ لڑکیوں
کو سبق پڑھا کر اپنے خانہ داری کے کاموں میں مصروف ہوئیں۔
لیکن بیچ بیچ میں کئی بار آکر اختری کو دیکھتی اور ضروری ہدایات
دیتی رہیں۔

بارہ بجے تک اختری بیگم بدستور اپنے کام میں مصروف رہیں
اس کے بعد اُستانی جی کی اجازت سے گھر گئیں۔ کھانا کھا کر آدھ
گھنٹہ آرام کیا۔ پھر گھر کے کاموں میں اپنی پھوپی کو تھوڑی بہت
مدد دی۔ اور ظہر کی نماز پڑھ کر دو بجے پھر اُستانی جی کی خدمت
میں حاضر ہو گئیں۔ اور شام تک پھر برابر بخیہ کی مشق جاری رہی۔
عصر کی نماز بھی یہیں پڑھی۔ مغرب کی اذان سُن کر اُستانی جی
نے چھٹی دی۔ اور اختری نے گھر جا کر نماز مغرب ادا کی۔ دن بھر میں
پورا گولہ ختم کر لیا تھا۔ اور بخیہ ٹھیک کرنے لگی تھی۔ دوسرے دن
اُستانی جی نے دوسرا گولہ دیا۔ اور آج کپڑے کے کنارے موڑ کر
بخیہ کرنا۔ اور مشین کے زائد پرزوں مثلاً ٹانک مارکر۔ رفلر وغیرہ سے
کام کرنا سکھایا۔ اور آج شام تک ان سب کاموں کی مشق کرائی۔
درمیان میں بخیہ کا نمبر گھٹانا بڑھانا اُوپر نیچے کے ڈوروں کا ڈھیلا
تنگ کرنا۔ بابن میں ڈورہ بھرنا۔ سوئی لگانا وغیرہ بھی بتا دیا۔ غرض

دو روز کی لگاتار محنت میں اُستانی جی کی عنایت اور اپنی خداداد ذہانت کی بدولت اختری نے مشین کا ہر قسم کا کام سیکھ لیا۔

تیسرے دن اُستانی جی نے کاج بنانے کی مشق شروع کرائی۔ اور تین دن کی مشق میں موٹے مہین ہر قسم کے کپڑوں میں۔ ڈورا رکھ کر اور بغیر ڈورے کے غرض ہر قسم کے انگریزی وضع کے کاج بنانے اور بٹن ٹانکنے کی مشق کرا دی۔ چھٹے دن جب ان کو اختری کی محنت، ذہانت۔ قابلیت اور استعداد پر پورا بھروسہ ہو گیا۔ تو انھوں نے ایک اعلان اس مضمون کا لکھ کر اپنے تمام کنبے اور شناساؤں نیز اپنی تمام شاگردوں کے یہاں گشت کرا دیا۔

محترمہ من تسلیم۔ آج کل ہمارے ہاں ایک سینے والی آئی ہوئی ہیں۔ ہر قسم کی سلائی (نئے اور پرانے فیشن کے کپڑے) عمدہ سے عمدہ تیار کر سکتی ہیں۔ اور چونکہ ضرورت مند ہیں۔ اس لئے درزی سے ایک چوتھائی کم اُجرت لینے پر تیار ہیں۔ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں۔ کہ ان کے ہاتھ کے تیار شدہ کپڑے کیا بلحاظ تراش اور کیا بلحاظ سلائی کی درستی اور صفائی کسی طرح اُستاد درزیوں کے ہاتھ کے کام سے کم نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اگر آپ کو ارزاں اُجرت پر بہتر سے بہتر کام کرانا ہے۔ تو اس نادر موقع کو ہاتھ سے نہ دیجیئے۔ ایک بار امتحان شرط ہے۔ خدا کی ذات سے مجھے کامل یقین ہے کہ ایک مرتبہ ان کا کام دیکھ کر آپ کو خود بخود گراں اُجرت لینے اور بیگاری کام کرنے والے درزیوں سے نفرت ہو جائے گی۔ آپ کی نسوانی ہمدردی کو دیکھتے ہوئے میری یہ اُمید بے جا نہ ہو گی۔ کہ آپ

اپنی ایک غریب اور ضرورت مند بہن کی امداد و اعانت بھی اپنا ایک ضروری فرض سمجھیں گی۔ اور ان سے کام لے کر اور ان کو مدد پہنچا کر اور خود کفایت کر کے ہم خرما وہم ثواب کی مصداق بنیں گی۔ فقط والسلام

آپ کی مخلص ......

اُستانی صاحبہ کا کُنبہ بھی ماشاء اللہ وسیع تھا۔ اس کے علاوہ اُن کے حُسن اخلاق کی وجہ سے دائرہ ملاقات بھی کافی تھا۔ پھر شاگردوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ غرض اس اعلان کے ذریعہ سے قریب قریب آدھے شہر میں اطلاع ہوگی۔ اور دوسرے ہی روز سے معقول تعداد میں سلائی کے کپڑے آنے شروع ہوئے۔ اور رفتہ رفتہ اتنے زیادہ ہوگئے۔ کہ خود اُستانی جی بھی کچھ گھبرا سی گئیں۔ اور اختری تو بہت ہی سٹ پٹائی۔ لیکن اس موقع پر اُستانی صاحبہ نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ یعنی کُرتے پاجامے وغیرہ اور اسی قسم کے سب کپڑے جو ہاتھ سے سلتے ہیں۔ اُٹھا کر محلے کی غریب سینے والیوں کے پاس بھیج دیئے۔ اور باقی نئے فیشن کے وہ تمام کپڑے جو مشین سے سلتے ہیں۔ اپنے پاس رہنے دیئے۔ اختری کو پاس بٹھا کر وہ سب کپڑوں کو خود قطع کرتیں۔ اور اپنے سامنے اس سے سلواتیں۔ بلکہ جہاں ضرورت سمجھتیں۔ سلائی میں بھی خود اس کی مدد کرتیں۔ بعد تیاری شروع شروع میں استری وغیرہ بھی خود کی۔ پھر رفتہ رفتہ اس سے کرانے لگیں۔ جو کام ہاتھ کے کرنے کا ہوتا۔ وہ مناسب ہدایتوں کے ساتھ اُسے گھر لے جا کر کرنے کے لئے دے دیتیں جسے وہ رات کے وقت کرلیتی۔ غرض ان کی کوشش و نگرانی میں عمدہ

سے عمدہ کام ہوا۔ اور ایک کپڑا بھی خراب نہ ہونے پایا ؛

اُستانی صاحبہ روزانہ اُجرت کا حساب لکھتی۔ اور اپنے پاس جمع کرتی رہیں۔ یکم نومبر کو انہوں نے سب حساب صاف کیا۔ تو جو کپڑے دوسری سینے والیوں نے سئے تھے۔ ان کی اُجرت دے کر تاگے کے دام مُجرا کر کے پورے آٹھ روپے بچے۔ وہ انہوں نے یہ کہہ کر اختری کے حوالے کئے۔ کہ "لو بوا خدا نے مجھے تم سے سُرخرو کیا۔ شکر ہے اُس کا کہ پہلے ہی مہینے میں تمہیں اتنی آمدنی ہوگئی۔ جتنی گوٹے میں ہوتی تھی۔ دوسری تاریخ سے تم میرے پاس آئی ہو۔ دو دن وہ بے کار گئے۔ اور چھ دن مشق میں گزرے۔ اس طرح پورے آٹھ دن خالی نکل گئے۔ صرف ۲۳ [1] دن کام ہوا۔ اب خدا نے چاہا پورے مہینہ بھر کام ہوگا۔ اور اب تمہارا ہاتھ بھی صاف اور تیز ہوتا جاتا ہے۔ خدا نے چاہا اور ترقی ہوگی" ؛

اختری کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے۔ اس نے اُٹھ کر اُستانی جی کو سلام کیا۔ اور کہا "اُستانی جی یہ سب آپ کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ ورنہ میں کس قابل ہوں" پانچ روپے اس نے اسی وقت نند کے قرضے میں ادا کر دئے۔ اور تین روپے پھوپی کو اپنے کھانے کے حساب میں دے دئے۔ پچھلے مہینے میں جو ایک روپیہ اپنی متفرق ضروریات کے لئے بچا لیا تھا۔ اس میں سے آٹھ آنے باقی تھے۔ وہ اس مہینے کے لئے رہے۔ مگر یہ فکر ضرور تھی۔ کہ جاڑا سر پر آگیا۔ اور اس کا سامان بالکل پاس نہیں ہے۔ خیر خدا مالک ہے۔ وہ خود کچھ نہ کچھ سامان کر دے گا۔ یہ سب سوچ سمجھ کر وہ پھر بدستور اپنے کام میں مشغول ہوگئی ؛

[1] اکتوبر کا مہینہ ۳۱ دن کا ہوتا ہے ؛

اب اُدھر کا حال سنئے۔ کہ خاں صاحب کی کیسی گزری۔ راستہ بخیریت تمام کرکے وہ اسٹیشن پر اُترے ہی تھے۔ کہ انہیں اپنے ایک پُرانے دوست مل گئے۔ صورت دیکھتے ہی دوڑ کر گلے سے لپٹ گئے۔ اور بڑی خاطر سے اپنے گھر لے گئے۔ ہزار خاں صاحب نے اصرار کیا۔ مگر انہوں نے آٹھ دن تک انہیں اپنا مہمان رکھا۔ خاں صاحب گو غریب تھے۔ لیکن نہایت غیرت مند دل رکھتے تھے۔ انہیں مُفت کی پرائی روٹیاں توڑنا سخت ناگوار تھا۔ آخر بڑی مشکل سے اُنہوں نے آٹھ روز کی مہمانی کے بعد اپنے کھانے کا انتظام ایک نان بائی کے ہاں کرلیا۔ دونوں وقت میں چار آنے کا روٹی سالن خرید کر کھا لیتے۔ مگر سوتے انہیں دوست کے ہاں تھے۔ اس طرح بیس دن میں پانچ روپے تو کھانے میں خرچ ہوئے۔ دو روپے آٹھ آنے سفر خرچ اور متفرق ضروریات میں صرف ہوکر ساڑھے سات روپے ان کے پاس باقی رہے۔ جو انہوں نے پہلی تاریخ کو فوراً بذریعہ منی آرڈر بیوی کو بھیج دئے۔ کیونکہ اب وہ دل سے اس کی قدر کرتے۔ اور سوتے جاگتے کسی وقت اس کی فکر سے غافل نہ رہتے تھے۔

اختری نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور فوراً جاڑے کے استقبال کی تیاری شروع کردی۔ اب کے اُسے اتفاق سے کپڑا بہت سستا مل گیا۔ اُستانی جی کے ہاں ایک ٹکڑے والی آتی تھی۔ وہ بڑی خوش وضع چھینٹوں کے بڑے بڑے ٹکڑے لائی۔ جو اگرچہ کمزور تھے۔ لیکن خوش وضع اور سستے تھے۔ اس لئے اختری نے آنکھ بند کرکے لے لئے۔ چھ گز تھے۔ اور گز بھر کا عرض تھا۔ اس نے ڈھائی

گز لمبا ڈیڑھ پاٹ کا لحاف بنایا۔ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے کا ابرا ہوا۔ استر کے لئے چار آنے گز کا رنگین کپڑا پونے چار گز پندرہ آنے کا لیا۔ ایک گز بھر کا اتنے ہی عرض کا ٹکڑا چھ آنے کا گوٹ کے لئے لیا۔ غرض یہ سب دو روپے بارہ آنے میں ہو گیا۔ روئی بھی اب موسم کی وجہ سے سوا سیر کی ہو گئی تھی۔ اور لحاف بھی مختصر تھا۔ اس لئے دو روپے کی کافی ہو گئی۔ (بلکہ اس میں سے بھی ڈیڑھ پاؤ رضائی اور مرزئی کے لئے بچا لی۔ کیونکہ یہاں کی تول انگریزی تول سے زیادہ تھی۔ یعنی انگریزی سیر اتنی روپے کا ہوتا ہے۔ اور یہاں کا پورے سو روپے کا۔ اس طرح انگریزی سیر سے پورا پاؤ بھر زیادہ ہوتا ہے۔ اور یہاں کا دو سیر انگریزی ڈھائی سیر کے برابر ہوتا ہے۔) چھ آنے بھرائی گئی۔ اس طرح پانچ روپے ڈیڑھ آنہ میں لحاف بھی تیار ہو گیا۔ اور ڈیڑھ پاؤ روئی بھی بچ گئی۔ اب مرزئی کی فکر ہوئی۔ سوا گز چھینٹ ساڑھے سات آنے کی۔ استر پانچ آنے کا۔ بھرائی ایک آنہ۔ اس طرح ساڑھے تیرہ آنے میں اس سے بھی نجات ہوئی۔ اب صرف ایک روپیہ ساڑھے نو آنے باقی تھے۔ اور ایک ہلکی رضائی ہر وقت کے استعمال کی بنانی بھی ضروری تھی۔ جو اِن داموں میں کسی طرح نہ بن سکتی تھی۔ مجبوراً اختری نے اپنے دو پُرانے دوپٹے مرمت کر دو آنے کی سُرخ پُڑیہ میں رنگ کر استر اور میاں نہ تیار کیا۔ اس زمانے میں ٹسری ساڑیوں کا بڑا زور تھا۔ ایک روپیہ چار آنے کو ساڑی اور دس دس آنے اَدّھا بک رہا تھا۔ اور لوگ دھڑا دھڑ خرید خرید کر رضائیاں دُلائیاں تیار کر رہے تھے۔ اختری نے بھی ایک اَدّھا دس آنے میں لے لیا۔ اور سات آنے کے نرمے

کے ٹکڑے لے کر گوٹ بنالی۔ اُودا ابرا تھا۔ اس پر ندو چار خانہ۔ سبز نرے کی گوٹ نے جان ڈال دی۔ وہ بہاردار رضائی تیار ہوئی۔ کہ سبحان اللہ۔ چار آنے بھرائی کے گئے۔ اور اس طرح سات روپے چار آنے میں خاصی جڑاول تیار ہوگئی۔ اس مہینے میں خدا کے فضل سے پورے دس روپے کی آمدنی ہوئی۔ لیکن فوراً ہی اختری نے پانچ روپے قرضہ میں اور پانچ پھوپی کو کھانے کے داموں میں دے دیئے۔ اور اس مہینے میں اوپری خرچ کے لئے اس کے پاس صرف چار آنے ہی باقی رہے ۔

اب کی مرتبہ خاں صاحب بھی کچھ نہ بھیج سکے۔ کیونکہ پیشگی تنخواہ اسی شرط پر لی تھی۔ کہ پانچ روپے ماہوار تین ماہ تک مجرا ہوتی رہے گی۔ لہٰذا اس سے پیشتر اور اس مہینے میں بھی انہیں تنخواہ میں سے صرف دس دس روپے ملے۔ جس میں سے ساڑھے سات روپے ان کے کھانے میں صرف ہو جاتے۔ اور دو روپے آٹھ آنے اوپری ضروریات میں۔ غرض پچھلے دو مہینے وہ بے چارے ایک پیسہ بھی بیوی کو نہ بھیج سکے۔ مگر اس فکر سے ایک منٹ غافل نہ ہوتے۔ اور ہر وقت اس کی ندامت ان کے سر پر سوار رہتی۔ بیوی کو بھی نہایت لجاجت کے ساتھ معذرت کا خط لکھا۔ لیکن اس کی تیوری پر ذرا بھی بل نہ تھا کیونکہ وہ اُسی کو غنیمت سمجھتی تھی۔ کہ خاں صاحب اپنے روزگار سے تو لگے ہوئے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں وہ زمانہ پھرتا تھا۔ جب میاں نے کسی ملازمت کو ایک سال سے زیادہ نہ جمنے دیا تھا۔ اب اس کے لئے یہی کیا کم شکر کی جگہ تھی۔ کہ سوا برس سے وہ اپنے کام کو مستقل

مزاجی سے برابر کر رہے تھے۔ اس نے سوچ لیا تھا۔ کہ خدا کا شکر ہے۔ میرا کام تو برابر چل رہا ہے۔ اور انشاء اللہ ان کی واپسی تک قرضہ سے بھی سبکدوش ہو جاؤں گی۔ کپڑا بھی جو ضروری تھا۔ بن ہی چکا۔ مگر ہاں یہ فکر ضرور ہے۔ کہ اس ماہ کے اختتام پر مشین خریدنے کے لئے کم از کم دس روپے نقد ہاتھ میں ہوتے۔ مگر خدا مالک ہے۔ کوئی نہ کوئی سامان ہو ہی جائے گا۔ اور کچھ نہیں تو قرض ہی لے لئے جائیں گے ؎

خیر انہیں خیالات میں یہ تیسرا مہینہ بھی بخیریت تمام ہوا۔ اور اِس مرتبہ بھی اختری کو دس روپے کی آمدنی ہوئی۔ اور حسب معمول فوراً اس نے ان کا حساب برابر کر دیا۔ دوسری کو خاں صاحب بھی بخیریت تمام گھر واپس آئے۔ چلتے وقت انہیں اپنے فرائض کو مستعدی اور قابلیت کے ساتھ انجام دینے پر دس روپے انعام ملا۔ اللہ اللہ یہ وہی خاں صاحب ہیں۔ جو کبھی چھ ماہ بھی ایک کام پر نہ جمتے تھے۔ اور آج تک کبھی اپنے آقا کو خوش نہ رکھ سکے تھے۔ آج محض اپنی فرشتہ خصلت بی بی کی بدولت پہلا موقع تھا۔ کہ انہوں نے کارِ منصبی کو عمدہ طریقے سے انجام دینے پر انعام حاصل کیا۔ ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ پہلے سوچا۔ کہ لاؤ اس سے بیوی کے لئے کوئی تحفہ خرید لیں۔ پھر خیال کیا۔ کہ اتنے دنوں سے نہ معلوم وہ غریب کس کس طرح اپنے دن کاٹ رہی ہو گی۔ جانے کس کس کا قرضہ ہو گیا ہو گا۔ اور کیا کیا ضرورتیں درپیش ہوں گی۔ نقد روپیہ ہی لے جانا بہتر ہے۔ یہ سب سوچ کر وہ دس روپے تنخواہ کے اور دس روپے انعام

کے پورے بیس روپے لے کر گھر چلے۔ دو روپے راستہ میں خرچ ہوئے۔ اٹھارہ لے جاکر بیوی کے ہاتھ میں دیئے۔ اور پورا قصّہ کہہ سُنایا۔

اختری نے ہنس کر کہا۔ خیر یہ تو بہت اچھا کیا۔ کہ تم میرے لئے کوئی تحفہ نہ لائے۔ مفت میں روپیہ بھی خرچ ہوتا۔ اور نہ معلوم وہ میری پسند کا بھی ہوتا یا نہیں۔ اب میں خود اپنی پسند کا جو چاہونگی منگوالوں گی۔ بس اتنا کہہ دو۔ کہ "یہ دس روپے تمہارے ہیں"۔ مگر ہاں بھائی بہنوں کے لئے ضرور کچھ ہونا چاہئے۔ خیر کچھ پروا نہیں میں تھوڑی سی مٹھائی منگوائے لیتی ہوں۔ خاں صاحب نے کہا۔ دس کیسے جو کچھ ہے۔ سب تمہارا ہی ہے۔ اور تم پوری مختار ہو جو چاہو کرو۔ اختری نے ایک روپیہ کی مٹھائی منگوا کر کچھ تو محلّہ کے غریب بچوں کو تقسیم کر دی۔ تھوڑی سی اُستانی جی کو بھیجی۔ ماں اور پھوپی کے آگے رکھی۔ اور تھوڑی تھوڑی چاروں نندوں اور جیٹھ کے یہاں خاں صاحب کی آمد کی اطلاع کے ساتھ بھیج دی۔ تیسرے پہر کو خاں صاحب جاکر سب بھائی بہنوں اور دوستوں سے مل آئے۔

نیا سال اور نئی زندگی

رات کو فرصت سے اختری نے اپنا قصہ چھیڑا اور اپنے ہاتھ کے تیار کئے ہوئے نفیس کپڑے دکھا کر کہا۔ کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ اب میں اُستانی جی کی بدولت اس قسم کے تمام کپڑے بغیر اُن کی مدد کے قطع کرتی اور سیتی ہوں۔ مگر مشین کی دقت ہے۔ یہ سب کام مشین کے محتاج ہیں۔ اب تک تو اُستانی جی نے مہربانی سے اپنی مشین دے رکھی تھی۔ مگر گھر جا کر دقت ہوگی۔ اس لئے میں چاہتی ہوں۔ کہ یہاں سے جانے سے پیشتر ایک سلائی کی مشین خرید لوں۔ صرف دس روپے پیشگی دینے ہوں گے۔ باقی پانچ روپے ماہوار کی قسط مقرر ہو جائے گی۔ جو خدا نے چاہا۔ نہایت آسانی سے ادا ہوتی رہے گی۔ جنوری کا مہینہ ہے۔ اور میں چاہتی ہوں۔ کہ اس سال ہماری زندگی بھی نئے طریقہ سے شروع ہو۔ اور گزشتہ سال اپنے ساتھ ہمارے تمام دلدر لے کر رخصت ہوا ہو۔ اسی خیال سے جس طرح بنا۔ میں نے آپا جان کا قرضہ بھی ادا کر دیا۔ کہ آئندہ سال میں کسی کی مقروض نہ رہوں۔ اور اب خدا کا شکر ہے۔ کہ ایک پیسہ بھی ہمارے اُوپر کسی کا باقی نہیں۔ سترہ روپے نقد اس وقت موجود ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو دس روپے دے کر مشین منگالوں۔ پھر سات روپے

باقی رہیں گے۔ جس میں گھر جاکر ہرگز گزر نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر اتنی مہربانی آؤر کرو کہ ابھی ایک مہینہ آؤر یہیں قیام کرو۔ تو یہ ہو سکتا ہے۔ فی الحال دو روپے اپنی ضرورتوں کے لئے رکھ کر صرف پانچ روپے پھوپی کو اپنے کھانے کے بندوبست کے لئے دے دوں اور پانچ روپے پھر پندرہ دن بعد دے دوں۔ اس طرح کام چل جائے گا۔ ایک جگہ رہنے میں بہت کفایت ہوتی ہے۔ دوسرے مجھے خیال ہے۔ کہ یوں تو مشین کا کام اچھی طرح آگیا ہے۔ لیکن نئی مشین کے سمجھنے میں ممکن ہے کچھ دقت ہو۔ اس لئے اگر چند روز اُستانی جی کے سامنے اُس سے کام کر لوں گی۔ تو میری جھجک نکل جائیگی ؞

خاں صاحب نے تمام باتوں کو محوِ حیرت ہو کر سُنا۔ اب ان کے دل میں بیوی کی قدر پہلے سے بھی سوائی ہو گئی تھی۔ اور انہیں اختلافِ رائے کا یارا باقی نہ تھا۔ کہنے لگے "تم مختار ہو۔ جو مناسب سمجھو کرو۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ مجھ میں اتنی عقل ہی نہیں۔ کہ تمہاری ترکیبوں کو سمجھ سکوں۔ اگر مجھ میں مادہ ہوتا۔ تو آج تمہیں یہ زحمتیں کیوں برداشت کرنی پڑتیں۔ میں خدا کی اس مہربانی کا شکر کسی طرح نہیں ادا کر سکتا۔ کہ اس نے تم سی فرشتہ خصال بیوی سے میرا واسطہ ڈالا۔ لیکن از روئے ایمان کہتا ہوں۔ کہ مجھے تمہاری تقدیر پر افسوس ہوتا ہے۔ جس نے مجھ سے نااہل سے ٹکر کھائی ؞

اختری نے کہا۔ خیر یہ باتیں تو رہنے دیجئے۔ جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ اور جو کچھ ہوگا۔ خدا کی مہربانی سے اُمید ہے۔ کہ ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔ مگر یہ ضرور ہے۔ کہ اب میں اس طرح سے تقدیر پر شاکر

رہنے والوں سے بیزار ہوں۔ کہ "جو تقدیر میں ہوگا۔ ہو رہے گا"۔ اور میرا خیال یہ ہے۔ کہ انسان کو اپنی تقدیر کے بنانے بگاڑنے میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور ہے ؎

کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

لیکن اپنے ہاتھ پیر ڈال کر بیٹھ جایئے۔ اور تقدیر کے سر الزام تھوپ دیجئے۔ تو اس کا کیا علاج۔ ہاں اگر ہم اپنی سی ہر طرح کوشش کرلیں۔ اور پھر بھی ہمیں خدانخواستہ ناکامیوں کا سامنا ہو۔ تو خیر تقدیر کو الزام دینے میں مضائقہ نہیں۔ مگر پھر بھی میرا تو عقیدہ یہ ہے۔ کہ جو شخص ہمت کرے۔ اور خود سنبھلنے کی کوشش کرے۔ ضرور ہے۔ کہ قدرت اس کا ساتھ دیتی ہے۔ مثل ہے۔ کہ ہمت کا حامی خدا ہے۔ اور کسی شخص پر کیا موقوف ہے۔ قوموں کی یہی حالت ہے۔ کہ

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی۔
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا +

غرض جو سنبھلنا چاہتا ہے۔ خدا بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ دُور کیوں جاؤ۔ اپنے ہمسایہ ہندوؤں ہی کو دیکھ لو۔ کل کچھ تھے۔ آج کچھ ہیں۔ ماشاءاللہ ایک سے ایک دن بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ اور وہی ہمارے تجارت پیشہ مسلمان بھائی ہیں۔ کہ اوّل دن سے جس حالت میں تھے۔ دس برس گزرنے پر بھی اُسی جگہ نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے۔ کہ ان کے دماغوں میں بچپن سے یہ خیال جاگزیں ہے۔ کہ اپنی ترقی کے لئے کوشش کرنا۔ اور ہاتھ پیر مارنا قسمت سے لڑنا ہے۔ بدقسمتی سے قناعت کے معنی ہمارے یہاں یہ ہیں۔ کہ ہاتھ پیر

اور دماغ کو معطل کر کے خدا کے بھروسے پر بیٹھ جائیں۔ اور اس حالت میں جو کچھ پیش آئے۔ اس کا الزام تقدیر کے سر تھوپا کریں۔ کوئی خدا کا بندہ یہ نہیں سوچتا۔ کہ جب خداوند کریم نے ہمیں جسمانی اور دماغی قوتوں سے بہرہ مند فرمایا۔ اور ہماری رہبری کے لئے عقل جیسی نعمت عطا فرمائی۔ تو اب ہمیں اور کس چیز کی ضرورت باقی رہی۔ سوائے اس کے فضل اور رحمت کے تو اس کا اللہ تعالےٰ نے خود وعدہ فرمایا ہے۔ کہ جو ہمت اور کوشش کرے گا۔ میں اس کی مدد کروں گا۔ اب ظاہر ہے۔ کہ ہمیں اُس کے فضل وکرم کی اُمید بھی اسی حالت میں رکھنی چاہیئے۔ جب کہ ہم اس کی دی ہوئی طاقتوں کو کام میں لائیں نہ یہ کہ اس کی بخشی ہوئی تمام قوتوں کو معطل کر دیں۔ اور اس کے فضل و رحمت کے جویاں ہوں +

اس دلچسپ بحث کے بعد صبح کو اختری بیگم خوشی خوشی دس روپے لے کر اُستانی صاحبہ کے پاس پہنچیں اور مشین منگانے کی فرمائش کردی اپنی کوششوں کو بار آور ہوتے دیکھ کر اُستانی جی کو اختری سے بھی زیادہ خوشی ہوئی۔ اور اُنہوں نے اپنے بھائی کی معرفت سَو روپے کی ایک سنگر مشین منگوا دی۔ اتفاق دیکھئے۔ کہ جس دن خاں صاحب سفر سے واپس آ کر اپنے دوستوں سے ملنے گئے۔ تو ان کے پُرانے دوست احمد علی ٹوپی والے سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ کچھ متفکر سے معلوم ہوتے تھے۔ علیک سلیک کے بعد خاں صاحب نے سبب دریافت کیا۔ کہنے لگے بھئی کیا بتاؤں۔ تمہیں معلوم ہے۔ کہ میرے پاس ایک ہی مشین ہے۔ اور میں تنہا اپنا کام کرنے والا ہوں

اس لئے مجبوراً دو پلی ٹوپیوں پر دجن کی نکاسی اَوْر ہر قسم کی ٹوپیوں
سے زیادہ ہے) میں اُجرت پر بخیہ کرواتا ہوں۔ چار آنے کوڑی پر
برسوں سے یہ کام ہو رہا تھا۔ اب نئے دُکان داروں نے بھاؤ بگاڑنا
شروع کر دیا ہے۔ میرا درزی بھی بگڑ گیا۔ اور مدت سے کہہ رہا تھا۔ کہ
پانچ آنے کوڑی سے کم نہ لوں گا۔ میں ٹالتا رہا۔ مگر آج اس نے صاف
جواب دے دیا۔ اور ٹوپیوں کا بنڈل لینے سے انکار کر دیا۔ اب کسی
دوسرے درزی کی تلاش میں ہوں۔ مگر مشکل یہ ہے۔ کہ نئے دکانداروں
نے زیادہ اُجرت دے دے کر سب کے دماغ بگاڑ دیئے ہیں۔ خوب
جانتا ہوں۔ کہ ان کی اس رفتار سے بہت جلد ان کی دُکانوں کے
دیوالے نکلنے والے ہیں۔ اس وقت ان کے دماغ صحیح ہوں گے۔ مگر
فی الحال ہم پُرانے لوگوں کو بھی وقت کا سامنا ضرور ہے ؎

اس وقت تو خاں صاحب احمد علی کی گفتگو سُن کر خاموش ہو گئے۔
لیکن گھر آکر جب بیوی کا قصہ سُنا۔ تو اس سے بھی اس کا ذکر کیا۔
اختری تو سُن کر اُچھل پڑی۔ اور کہا۔ خدا کے لئے تم صبح ہی کو جا کر
وہ بنڈل جو درزی واپس کر گیا ہے۔ لے آؤ۔ ایسا نہ ہو وہ کسی اَوْر
کو دے دیں۔ خاں صاحب نے جا کر اپنے دوست سے ذکر کیا۔ انہوں
نے ایک ٹوپی نمونہ کے لئے دی۔ اور ایک امتحاناً بخیہ کرنے کے لئے۔ اور
کہا۔ میں بانگی دیکھ لوں۔ اگر مجھے پسند آگیا۔ تو اپنی دُکان کا تمام زاید
کام تمہارے ہی یہاں بھیجا کروں گا ؏

خیر اختری نے ٹوپی تیار کی۔ نئی مشین کا نفیس بخیہ۔ پھر اختری
کے ہاتھ کی صفائی احمد علی دیکھ کر خوش ہو گئے۔ اور اکٹھی چار کوڑی

ٹوپیاں اُٹھا کر حوالے کر دیں۔ اور وعدہ کیا۔ کہ انشاء اللہ ایک کوڑی روزانہ تمہارے پاس پہنچتی رہیں گی۔ اختری نے گھڑی دیکھ کر ایک کوڑی آدھے گھنٹہ میں تیار کرلیں۔ اسے بڑی خوشی ہوئی۔ کہ آدھے گھنٹے میں چار آنے اُجرت کے ہو گئے۔ اس دن سے وہ اپنے معمولی کام کے ساتھ ایک کوڑی ٹوپیاں بھی روزانہ تیار کرنے لگی۔ جس دن سے مشین آئی۔ اُستانی جی تمام حساب کتاب اختری کے حوالے کرکے سبکدوش ہوگئی تھیں۔ لیکن اختری نے بھی روز کی اُجرت برابر جمع کی۔ اور جس دن خاں صاحب نے اپنی تنخواہ لاکر اُسے دی۔ اُسی دن اُس نے بھی جاکر اپنی گولک کھولی۔ اور پورے بیس روپے لاکر خاں صاحب کے آگے رکھ دئے۔ لیکن اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ کہ خاں صاحب نے اس کی خوشی میں کچھ زیادہ حصّہ نہیں لیا۔ بلکہ کچھ افسردہ سے ہو گئے۔ لیکن فوراً ہی اس کی ذہانت نے تاڑ لیا۔ کہ خاں صاحب کو اس کی آمدنی اپنے سے زیادہ دیکھ کر خجالت کے ساتھ اندیشہ بھی ہے۔ کہ ایسا نہ ہو بیوی کو اس کا غرور ہو جائے۔ اور وہ ان کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کا ذکر اس وقت اَور زیادہ ان کے ملال کا باعث ہوتا۔ اس لئے سمجھ دار اختری نے پھر سب روپیہ لے جاکر رکھ دیا۔ اور موقع کی منتظر رہی۔ اتفاق سے اُسی دن خاں صاحب احمد علی کے یہاں گئے۔ ان کو چُپ چُپ سا دیکھ کر احمد علی نے سبب دریافت کیا۔ پہلے تو اُنھوں نے ٹالنا چاہا۔ مگر احمد علی کے اصرار سے مجبور ہوکر سارا قصّہ کہہ سنایا۔ اپنا اندیشہ بھی ظاہر کیا۔ اور یہ بھی کہا۔ کہ اگر تمہاری بھی صلاح ہو تو میں یہ کام جو تمہارے ہاں سے جاتا ہے۔

بند کرا دوں۔ ان کی باتیں سُن کر احمد علی نے ایک قہقہہ لگا کر کہا۔ میاں کیوں پاگل ہوئے ہو۔ ایسی بیویاں قسمت والوں کو ملتی ہیں۔ ہم اسی ارمان میں مرتے ہیں۔ کہ ہماری گھر والی ذرا سا ہمارا ہاتھ بٹا دیا کرے۔ تو ہمارا کام اس سے دُگنا چمک جائے۔ ہزار دفعہ اس نیک بخت سے کہا۔ کہ مشین چلانا سیکھ لو۔ تو ایک آؤر خرید لیں۔ جو کام باہر اُجرت پر ہوتا ہے۔ وہ تم کر لیا کرو۔ مگر اس عقل کی دُشمن نے یہی جواب دیا کہ "نا صاحب میں باز آئی تمہاری اس مہربانی سے۔ مجھے گھر کے دھندوں سے اتنی مہلت کب ہے۔ جو میں تمہاری دُکان داری بھی سنبھالوں۔ عورت کے لئے گھر گرستی ہی کے دھندے کچھ کم نہیں۔ خدا نے جو کام جس کے لئے بنایا ہے۔ اُسے وہی زیبا ہے۔" میں کہہ کر بھی شرمندہ ہوا۔ اور اس دن سے کان پکڑا۔ ایک تم ناقدرے ہو۔ کہ ایسی بیوی سے آزردہ ہوتے ہو۔

خاں صاحب نے کہا۔ ہاں یہ تو سچ ہے۔ کہ اُس بے چاری نے میری عزت بنا دی ہے۔ مگر یہی خیال ہوتا ہے۔ کہ اب کہیں وہ اپنے آگے مجھے ذلیل و حقیر نہ سمجھنے لگے۔ احمد علی نے کہا۔ اگر وہ ایسی ہوتی۔ تو اب تک تمہیں اس کے انداز سے معلوم ہو گیا ہوتا۔ کیا پہلے کی نسبت تم اپنی خدمت اور خاطر مدارات میں کمی پاتے ہو؟

خاں صاحب۔ استغفر اللہ میں تو روز بروز اسے پہلے سے زیادہ اپنی خدمت پر کمر بستہ دیکھتا ہوں۔ والدہ مرحوم اگرچہ میری ماں تھیں۔ اور ان سے زیادہ کوئی میری محبت نہیں کر سکتا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کے بعد جس دن سے گھر کا انتظام ان کے ہاتھ میں آیا۔ میں کہہ

نہیں سکتا۔ کہ میں نے کتنی راحت پائی۔ سب سے بڑھ کر صفت یہ ہے
کہ جو دے دیا اسی پر قناعت ہے۔ اگر کمی ہوئی۔ تو خود ہی قرض کا انتظام
اس طرح کیا۔ کہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی۔ خود ہی لیا۔ اور
خود ہی جس طرح بنا ادا کیا۔ مجھے اس معاملے میں والدہ کے بعد سے
کبھی کوئی سروکار ہی نہیں رہا۔ پھر لطف یہ ہے۔ کہ جس چیز کی گھر
میں ضرورت ہو۔ یعنی جوتی کپڑا وغیرہ (کیا اپنے لئے اور کیا میرے لئے)
مجھے خبر بھی نہیں ہوتی۔ اور ضرورت کی ہر چیز مہیا ہو جاتی ہے۔ ابھی سفر
کو جاتے وقت تمام سامان جاڑے کا نیا تیار کر کے ساتھ کیا۔ اور پندرہ
روپے نقد میرے ہاتھ میں دیئے۔ ہزار میں نے کہا۔ کہ ابھی پورا مہینہ
پڑا ہے۔ کچھ تو تم اپنے لئے بھی رکھ لو۔ مگر اس نیک بخت نے یہی کہا۔ کہ
میری تم کچھ فکر نہ کرو۔ میں اپنی گزر کسی نہ کسی طرح کر ہی لوں گی۔ پردیس
میں تم کو اپنی گرہ مضبوط رکھنی چاہئے۔ وہاں جا کر تین مہینے میں میں نے
صرف سات روپے آٹھ آنے بھیجے۔ مگر اس پر بھی بے چاری نے کوئی
شکایت نہ کی۔ لطف یہ کہ اب آکر دیکھتا ہوں۔ تو اپنے لئے بھی
ضروری کپڑا بنا کر تیار کر رکھا ہے۔ غرض ایمان کی تو یہ ہے۔ کہ یہ سب
باتیں دیکھ دیکھ کر میری حیرت اور ندامت کی کوئی حد نہیں رہتی۔
اور یہی ندامت ہے۔ جو مجھے اب تک ملازمت سے دست بردار نہیں
ہونے دیتی۔ ورنہ وہی میں ہوں۔ کہ سال بھر میں دو مرتبہ استعفا
دیا کرتا تھا۔ اب کی دفعہ سوا برس سے مستقل کام کر رہا ہوں۔ اور
اس طرح دل لگا کر عمر بھر میں پہلی مرتبہ اپنے فرائض کو اچھی طرح
انجام دینے پر انعام حاصل کیا۔ یہ سب کچھ اسی نیک بخت کا طفیل ہے۔

احمد علی نے کہا۔ "پھر دوست تمہارے برابر احمق دُنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ جو ایسی بیوی کی بے قدری کرے۔ اور اس کے کام میں بجائے مدد دینے کے رخنہ انداز ہو۔ بھائی تمہارے گھر میں تو وہ لچھمی ہے۔ جو تمہارا سب دلدّر دور کردے گی۔ تم کو تو چاہیئے۔ کہ محنت سے اپنا کام کئے جاؤ۔ اور وہ جس راستے پر چل رہی ہے چلنے دو۔ تمہاری عقل کی رہنمائی کی۔ اُسے ضرورت نہیں۔ اس کو اس کی عقل پر چھوڑ دو پھر دیکھنا وہ تمہیں کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔"

خاں صاحب نے بھی جہاں تک غور کیا احمد علی کے ایک ایک لفظ کو درست پایا۔ بیوی کی جگہ دل میں اَور زیادہ ہوگئی۔ اور اپنی عقل پر افسوس ہوا۔ گھر میں آئے۔ تو اپنی حرکت پر نادم تھے۔ اور فکر تھی۔ کہ اس اپنی سرد مہری سے بیوی کو جو صدمہ پہنچایا ہے۔ کسی طرح اس کی تلافی ہو جائے۔ گھر میں نہایت خندہ پیشانی سے داخل ہوئے۔ اور بیوی سے کہنے لگے۔ ہاں صبح کو تم وہ روپیہ لائی تھیں۔ مگر مجھے اس وقت ایک ضروری کام تھا۔ میں جلدی میں چلا گیا۔ اب اس وقت لاؤ۔ سب حساب کتاب کرلیں۔ اور تمہاری صلاح ہو۔ تو اب یہاں سے چلنے کی فکر کی جائے۔ تمہارے کہنے کے مطابق ایک مہینہ تو گزر ہی گیا۔ اختری میاں کا یہ بدلا ہوا رنگ دیکھ کر نہال ہوگئی۔ اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ بغیر میری کوشش کے خود بخود راہ راست پر آگئے۔ فوراً جا کر سب روپیہ نکال لائی۔ اور کہنے لگی۔ کہ اس میں سے پانچ تو پھوپی کو دیتے ہیں۔ اور پانچ مشین کی قسط کے چلے جائیں گے۔ پانچ میں مجھے ایک استری اور دو چھوٹی

بڑی قینچیاں منگائی ہیں - غرض پندرہ تو اس طرح نکل جائیں گے - بیس گھر کے خرچ کے رہے - مکان کی فکر ضروری ہے - لیکن بُرا نہ مانو تو اتنا ضرور کہوں گی کہ اب اس مکان میں چلنے کی تو میری صلاح نہیں - یہ ضرور ہے - کہ اس کا کرایہ بہت کم ہے - مگر اسی کے لائق - وہ مکان بھی ہماری ضرورتوں کے لائق کم ہے - خاص کر اب یہ سلائی کا بکھیڑا جو بڑھ گیا ہے - تو اور بھی دقت ہو جائے گی - اور اس کے لئے کسی طرح وہ مکان کافی نہ ہوگا - یہاں پڑوس میں ایک مکان ہے - کرایہ ضرور چار روپے ہے - مگر بنا ہوا اس قرینے کا ہے - کہ ہر ضرورت کا خیال رکھا گیا ہے - پرسوں اُستانی جی مجھے دکھانے لے گئی تھیں - بیچ میں کمرہ ہے - اس کے آگے برآمدہ ہے - دو کوٹھڑیاں غسلخانہ پاخانہ باورچیخانہ ڈیوڑھی غرض ضرورت کی ہر چیز موجود ہے - صحن بھی کافی ہے - پھر یہاں سے بھی قریب ہے - اُستانی جی کے مکان سے بھی جب چاہیں پردہ کروا کر آ جا سکتے ہیں - غرض مجھے تو ہر طرح پسند ہے - صرف تمہاری اجازت کی منتظر ہوں - اگر تم بھی منظور کرو - تو آج اس کی صفائی ہو جائے اور کل ہی اس میں اٹھ چلیں - اُستانی جی کی مروت سے مالک مکان اس پر بھی تیار ہیں - کہ کرایہ پیشگی نہ لیں ۔

خاں صاحب کو پہلے تو بہت تامل ہوا - اور ہونے کی بات ہی تھی - آٹھ آنے سے ایک دم چار روپے ہو جانا - کہاں تک نہ کھلتا - مگر احمد علی کا یہ فقرہ اس وقت ان کے دماغ میں گونج رہا تھا - کہ "تمہاری عقل کی رہنمائی کی اُسے ضرورت نہیں - اسے اس کی عقل پہ چھوڑ دو - پھر دیکھنا - کہ وہ تمہیں کیا سے کیا بنا دیتی ہے" ۔

سے تامل کے بعد کہنے لگے "جیسی تمہاری مرضی - کرایہ تو ضرور زیادہ ہے لیکن اگر تم سمجھتی ہو - کہ آسانی سے ادا کر سکو گی - تو لے لو مجھے کوئی اعتراض نہیں * اختری خوش ہوگئی - اور کہنے لگی - خدا مالک ہے - مجھے اس کی ذات سے پوری اُمید ہے کہ کرایہ بہت آسانی سے نکلتا رہے گا - ورنہ خیر پھر کچھ انتظام ہو جائے گا - اس سے تم اطمینان رکھو - کہ تمہیں خدا نے چاہا کوئی پریشانی نہ ہو گی *

غرض اس روز اختری نے مکان کے لئے منظوری کہلا بھیجی - اور شام تک صفائی ہو کر دوسرے دن یہ لوگ اپنا اسباب لے کر نئے مکان میں جا بسے * ان بے چاروں کا اسباب ہی کتنا تھا - ذرا دیر میں اختری نے سب ٹھکانے رکھ دیا - مسہری اندر بچھا دی - دونوں تخت ملا کر برآمدے میں بچھا دئے - ایک طرف دونوں بانس کی چارپائیاں بچھا کر بستر کر دیئے - تخت کے ایک کونے پر مشین اور اس کے پاس سلائی کا چھوٹا سا ٹرنک رکھ دیا - دالان کے دوسرے کونے میں پانی کے برتن ایک مٹکا ایک گھڑا اور ایک صراحی رکھ دی - ایک کوٹھڑی میں اپنے صندوق وغیرہ رکھے - دوسری میں جنس کے خالی برتن قرینے سے لگا کر لکڑی اپلوں کی جگہ چھوڑ دی - اسی میں ایک کھونٹی پر ترازو ٹانگ دی - اور قریب کے طاق میں ہاون دستہ اور باٹ رکھ دیئے - ایک کونے میں چکی رکھ دی - (یہ تینوں چیزیں ساس کے ورثہ میں اُسے ملی تھیں -) کھانے پکانے کے برتن باورچی خانے کی الماری میں رکھ دیئے - اور ایک مٹکا پانی کا بھی باورچی خانے کے استعمال کے پانی کے لئے رکھ دیا - اس کے بعد مہینہ بھر کی جنس اکٹھی منگائی - دالیں چاول چُن پھٹک کر برتنوں میں

ڈھک ڈھکا کر رکھ دیا۔ مصالحہ دن بھر سکھا کر پسائی پر پسوا لیا۔ اور دوسرے روز وہ بھی اپنے اپنے ٹھکانے رکھ دیا۔ نمک مرچ گرم مصالحہ اور ضرورت کی چھوٹی چھوٹی چیزیں خود پیس کر شیشیوں میں بھر کر رکھ دیں۔ غرض یہ دن پورا انہیں کاموں میں گزرا۔ دوسرے دن سے وہ پھر حسب معمول اپنے سلائی کے کام میں مصروف ہو گئی ۔

اب اس کا معمول یہ تھا۔ کہ صبح پانچ بجے سے اُٹھ کر تمام گھر میں جھاڑو دیتی۔ اور ہر چیز کو جھاڑ پونچھ کر ٹھکانے سے رکھتی۔ آگ جلا کر پانی گرم کرتی۔ اور چھ بجے تک غسل کر کے کپڑے بدل کر نماز پڑھتی۔ پھر آدھ گھنٹے تک قرآن شریف کی تلاوت کرتی۔ اس کے بعد دو پیالیاں چائے کی بنا کر اور دو روغنی ٹکیاں جو رات ہی کو پکا رکھتی لا کر میاں کے آگے ناشتہ رکھتی۔ دونوں ناشتہ کر چکتے تو سات بجے خاں صاحب اپنے کام پر روانہ ہو جاتے۔ اور یہ اپنی سلائی لے بیٹھتی۔ گیارہ بجے تک سلائی میں مصروف رہنے کے بعد باورچی خانے میں جاتی۔ رات کا سالن گرم کرتی۔ اور تازی روٹی یا کھچڑی پکا کر بارہ بجے تک تیار کر لیتی۔ بارہ بجے خاں صاحب آ جاتے۔ اور دونوں ساتھ بیٹھ کر گرم کھانا کھاتے۔ اس کے بعد خاں صاحب اپنے دوستوں میں جا بیٹھتے۔ اور دو بجے پھر اپنے کام پر جاتے۔ اور اختری شام کے ہانڈی چولھے کے سامان میں لگ جاتی۔ گوشت ترکاری پان وغیرہ جو خاں صاحب دوپہر کو لیتے آتے۔ ٹھکانے سے رکھتی برتن دھوتی۔ مصالحہ پیستی۔ تیل بتی درست کرتی۔ ایک یا ڈیڑھ بجے تک ان کاموں سے فارغ ہو کر ظہر کی نماز پڑھتی۔ اور پھر اپنی سلائی لے

بیٹھتی - پانچ بجے اُٹھ کر عصر کی نماز پڑھتی - اور پھر باورچی خانے کی خبر لیتی - جھاڑو دے کر ہانڈی چڑھاتی - آٹا گوندھتی - چراغ جلاتی مغرب کی نماز پڑھ کر روٹی پکاتی - آٹھ بجے خاں صاحب آجاتے - تو دونوں کھانا کھاتے - اس کے بعد سب چیزیں رکھ ڈھک کر عشا کی نماز پڑھتی - اور اگر کام زیادہ ہوتا - تو پھر کچھ سلائی کرتی - ورنہ اپنا روزنامچہ اور حساب لکھ کر سو رہتی - مہینہ بھر اسی طرح بخیریت گزر گیا - اور اس دفعہ بھی حسب معمول بیس روپے آمدنی ہوئی - تنخواہ ملنے پر اختری نے پانچ روپے تو مشین کی قسط ادا کی - اور چار روپے کرایہ مکان - بارہ آنے بہشتی - چار آنے مہترانی کے دیئے - اور پانچ روپے کپڑے جوتے کی مد میں جمع کر دیئے - دھوبی کی دھلائی اس نے اپنے ذمے رکھی *
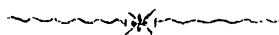
اختری کی شاگردیں اور کٹ پیس کا سامان

اب رفتہ رفتہ محلہ میں چرچا ہونے لگا۔ اور اُستانی جی کی دوسری شاگردوں کو بھی شوق ہوا۔ کہ اُستانی جی سے ہم بھی یہ کام سیکھیں۔ سب نے اپنے اپنے گھروں میں بھی تذکرہ کیا۔ اور لڑکیوں کی ماؤں اور خود لڑکیوں کا بھی اصرار ہوا۔ کہ اُستانی جی اختری بیگم کی طرح اپنی شاگردوں کو بھی سلائی کٹائی کا کام سکھائیں۔ اُستانی جی نے کہا۔ بوا مجھے پڑھانے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ میں اتنا دماغ کہاں سے لاؤں۔ کہ سلائی کٹائی بھی سکھاؤں۔ اختری کی بات دوسری تھی۔ اوّل تو وہ بڑی ذہین اور شوقین لڑکی ہے۔ دوسرے پڑھ لکھ چکی تھی۔ پھر اس کی ضرورت پر نظر کر کے میں نے اسے سکھا دیا۔ اب سب کے لئے یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے۔ کہ تم میں سے جو جو لڑکی اپنی تعلیم ختم کر چکنے کے قریب ہو۔ اُسے میں اختری کے سپرد کر دوں۔ اس کا گھر بھی یہیں ہے۔ پھر مردانہ بھی نہیں۔ اس کا میاں سات بجے صبح سے رات کے آٹھ بجے تک اپنی نوکری پر رہتا ہے۔ دوپہر کو دو گھنٹے کے لئے گھر پر آتا ہے۔ تو وہ وقت تم لوگوں کا بھی چھٹی کا ہے۔ جتنی کسر تم لوگوں کی پڑھائی میں رہ گئی ہے۔ اس کو گھر پر پورا کر لیا کرو۔ باقی وقت جس طرح میرے پاس صرف کرتی ہو۔ اختری کے پاس گزارو۔ اگر تم اس کے لئے تیار ہو۔ تو

آج ہی میں بُلا کر اس سے کہہ دوں۔ وہ بخوشی تیار ہو جائے گی ۔
چار لڑکیاں اس پر راضی ہوئیں۔ تو استانی جی نے اختری کو بُلا کر کہا" لو بی اختری خدا نے ہماری مدد کا ایک اور سامان پیدا کر دیا۔ میں دیکھتی ہوں۔ کہ ماشاءاللہ تمہارا کام روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ جس کو تم اکیلی بمشکل سنبھال سکو گی۔ یہ لڑکیاں تمہیں دیکھ کر سلائی سیکھنے کا شوق کر رہی ہیں۔ اس لئے میں نے سوچا۔ کہ ایک پنتھ دو کاج تم کو بھی مدد مل جائے گی۔ اور یہ بھی کام سیکھ جائیں گی۔ اس کے علاوہ گھر کے کاموں میں بھی تمہیں مدد ملے گی۔ میری بات تو دوسری ہے۔ کہ میرے پاس خدا کے فضل سے ماما نوکر موجود ہیں۔ مجھے ان سے کام کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر تم جب اُستانی ہو کر خود اپنے گھر کا کام کرو گی۔ اور پھر بلا معاوضہ ان کو سکھاؤ گی۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ یہ لوگ بھی گھر کے کاموں میں تمہارا ہاتھ نہ بٹائیں۔ میں نے چھانٹ کر ایسی لڑکیاں لی ہیں۔ جو اپنی تعلیم قریب قریب ختم کر چکی ہیں۔ اور اب ان میں کافی سمجھ اور شائستگی آ گئی ہے۔ ان سے تم کو خاصی مدد ملے گی اور سر مغزنی بھی کم کرنی پڑے گی۔ اگر تم منظور کر لو۔ تو کل ہی سے یہ لوگ آنا شروع کر دیں"۔
اختری نے کہا" اُستانی جی نیکی اور پوچھ پوچھ آپ جو کام بھی کرتی ہیں۔ میرے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ مجھ سے پوچھنے کی ضرورت کیا ہے۔ اور یہ تو سراسر میرے ہی فائدے کی بات ہے"۔ خیر دوسرے دن سے چاروں لڑکیاں اختری بیگم کی شاگردی میں آ گئیں۔ اختری نے دو چار دن تو اس طرح مشق کرائی۔ جس طرح خود اُستانی جی نے اُس سے

کرائی تھی۔ پھر یہ فکر ہوئی۔ کہ ان کا ہاتھ کس چیز پر صاف کراؤں۔ پرایا کپڑا اگر ان کے ہاتھ میں دیتی ہوں۔ تو خراب ہونے کا ڈر ہے۔ میرے ساتھ تو اُستانی جی برابر لگی رہتی تھیں۔ میں ان چاروں کے ساتھ کہاں تک لگوں گی۔

اس لئے اس نے پانچ روپے جو بچا کر رکھے۔ اس کا ایک بنڈل کٹ پیس کا منگا لیا۔ جس میں سے بچوں کی فراکیں۔ قمیص۔ ویسکوٹ۔ جانگئے۔ جمپر۔ رومپر غرض ہر قسم کے بیسیوں کپڑے بن گئے۔ دو چھٹانک کے حساب سے ۴۸ چھٹانک کپڑا تھا۔ جس میں اڑتالیس ہی کپڑے تیار ہوئے۔ اور کم و بیش ساڑھے چار چار آنے ان کی قیمت مقرر کر کے دو تین ٹکڑے والیوں کو (جو گھروں میں جا جا کر کٹ پیس بیچا کرتی تھیں) ایک آنہ روپیہ کمیشن دے کر بکوا ئے۔ چونکہ قیمت کم تھی۔ اور ہر قسم کے کپڑے سلے سلائے جو عام طور پر عورتیں سی نہیں سکتیں۔ اور درزی کپڑے کی قیمت سے زیادہ اُجرت مانگتے ہیں۔ اس لئے ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ اور فرمائشوں کی بھرمار ہو گئی۔

اب تو اختری کو بھی چسکہ پڑ گیا۔ اس لئے اس نے سوا روپیہ دھاگے اور کمیشن کا اس میں سے نکال کر باقی دس روپے کا دوسرا ایڑا تکیہ منگا لیا۔ اس میں کپڑا بھی اچھی قسم کا اور بڑے ٹکڑے نکلے۔ جس میں سے اُس نے کچھ زنانے کپڑے بنائے۔ اور کچھ بچوں کے اور پہلے کی طرح یہ بنڈل بھی آٹھ دن کے اندر اندر ختم ہو گیا۔ غرض مہینہ بھر اسی طرح کرنے سے تین تکئے دس دس کے بکے۔ جس میں تیس روپے کا نفع ہوا۔ اس میں سے پانچ روپے اپنے

تو اختری نے الگ کر لئے۔ باقی میں سے پانچ سوا سوا روپیہ کر کے چاروں لڑکیوں کو تقسیم کر دیئے۔ اور بیس ڈاک خانے میں جمع کرا دیئے۔ اب یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور لڑکیوں کو سوا سوا روپیہ ملنے سے اَور لوگوں کو بھی حوصلہ ہوا۔ کہ اپنی لڑکیوں کو اختری کی شاگردی میں دیں۔ کیونکہ درزی اپنی دُکان پر جن لڑکوں کو شاگردی میں بٹھاتے ہیں۔ اوّل تو مدتوں مفت کام لیتے ہیں۔ پھر چار چار آنے سے تنخواہ شروع کر کے برسوں میں کہیں روپیہ دو روپیہ کرتے ہیں یہاں پہلے مہینے سے سوا روپیہ ہو گیا۔ ادھر اُستانی جی کو ایک خیال اَور پیدا ہوا۔ انہوں نے کہا۔ اختری بیگم میں دیکھتی ہوں۔ اب ماشاءاللہ تمہاری شاگردوں کا ہاتھ خوب صاف ہو جاتا ہے۔ میری صلاح یہ ہے۔ کہ اب تم ذرا اَور بہتر قسم کا کپڑا تیار کراؤ۔ اور صفائی وغیرہ کا زیادہ خیال رکھو۔ اور ایسے کپڑے تیار کرو۔ جیسے مُکتی[1] فوج کی عورتیں بناتی ہیں۔ میں نے ایک ایجنٹ[2] سے جو مُکتی فوج کا سامان فروخت کرتا ہے۔ دریافت کیا تھا۔ کہ تم کو کتنی تنخواہ اور کمیشن ملتا ہے؟ اس نے کہا "دس روپے تنخواہ اور ایک آنہ فی روپیہ کمیشن"۔ میں نے کہا۔ اگر ہم تمہیں اپنا مال فروخت کرنے کے لئے دیں۔ تو کر دو گے؟ کہنے لگا کیا مضائقہ! ہمیں تو اپنے معاوضہ سے مطلب ہے۔ جو دے گا ہم اس کا کام کرنے کو تیار ہیں۔ اس لئے اب میں چاہتی ہوں۔ تم زیادہ تعداد میں کپڑے تیار کرو۔ اور "ڈران تھریڈ" ہکا بکا ٹانکا۔ کشیدہ۔ غرض ہر قسم کا کام ہو

---

[1] نو مسیحی عورتیں جو اپنے اور مشن کے فائدے کے لئے اس قسم کے کام کرتی ہیں۔

[2] جو دوسروں کا مال کچھ اُجرت لے کر فروخت کرے۔

کہ مکتی فوج کے کام میں مل کر فروخت ہو سکے۔

اختری نے کہا۔ اُستانی جی آپ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں آپ نے تو مجھے حیوان سے انسان بنا دیا۔ آپ کے ہر حکم کی میں سر آنکھوں سے تعمیل کرنے کو حاضر ہوں۔ مگر اس کام کے لئے دو مہینے کی مہلت چاہتی ہوں۔ کہ لڑکیوں کا ہاتھ بھی اچھی طرح صاف ہو جائے اور میں انہیں نئے کام بھی سکھا لوں جس میں آپ کی مدد کی بھی مجھے ضرورت ہو گی۔ اُستانی جی نے کہا۔ بسر و چشم۔ غرض چار لڑکیاں اَور نئی شامل ہوئیں۔ اور اختری نے سب کام اپنا سیکھا ہوا اور کچھ اَور نئے کام اُستانی جی سے سیکھ کر ان کو سکھائے۔ اور اب دو ماہ بعد ان کے یہاں بچوں کے اور زنانہ کپڑوں سے لے کر میز پوش۔ پردے تکیے کے غلاف۔ کُشن۔ ٹی کوزی۔ پلنگ پوش غرض ہر قسم کا وہ سامان تیار ہونے لگا۔ جو مکتی فوج کے ایجنٹ فروخت کرتے ہیں۔ اور خدا کی عنایت سے پہلے ہی مہینے میں کمیشن تنخواہ اور لڑکیوں کا وظیفہ ادا کر کے پچاس روپے کا منافع اختری بیگم کو ہوا۔ جس میں سے اُس نے پچیس روپے کی ایک پیر (ہینڈ) اپنی مشین کے لئے خرید لی۔ کیونکہ اب دستی مشین سے کام چلنا دشوار تھا۔ اُدھر اُسے گھر کی درستی کی بھی برابر فکر تھی۔ چھ مہینے میں اس نے گھر کے لئے تمام ضروری سامان فرش پردے ضروری فرنیچر سب مہیا کر لیا۔ اب مکان قریب ہونے کی وجہ سے اکثر اس کی پھوپی آنکلتیں۔ اور دیکھ کر باغ باغ ہو جاتیں۔ کہ وہی اختری جو آٹھ آنے مہینے کے جھونپڑے میں میلے کچیلے پھٹے پُرانے کپڑے لادے بیٹھی رہتی تھی سجے سجائے گھر میں صاف

ستھری پوشاک پہنے دستکاری میں مصروف نظر آتی ہے۔ سر میں خوشبودار تیل پڑا ہوا ہے۔ آنکھوں میں سرمہ۔ کپڑوں میں عطر کی بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی۔ (چونکہ شب خوابی اور باورچی خانے کے استعمال کے کپڑے الگ رہتے تھے۔ کبھی کسی نے اُسے میلا کچیلا نہ دیکھا۔) پھوپی دیکھ کر بے اختیار گلے سے لگا لیتیں۔ اور ہزاروں دعائیں دے ڈالتیں۔ اور جتنی دعائیں بھتیجی کو دیتیں۔ اس سے دُگنی اُستانی جی کو۔ جو واقعی اس کی مستحق بھی تھیں ؎

خاں صاحب کی تعلیم

اب خاں صاحب کا حال سُنئے۔ ان کے لیئے ان کی بیوی نے وہ سامان مہیا کر دیئے تھے۔ جن کا انہیں خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ ان کا رونگٹا رونگٹا ہر وقت اپنے خدا کا شکر گزار تھا۔ کہ اس نے ان کو دُنیا ہی میں ایسی بیوی دی۔ جو ان کے نزدیک کسی طرح حورِ جنّت سے کم نہیں۔ اور اسی دُنیا میں ان کے نزدیک اس نے انہیں بہشت میں پہنچا دیا ہے۔ وہی خاں صاحب جن کو ایک وقت کے سوا دوسرے وقت روٹی بھی مشکل سے میسّر آتی تھی۔ جاڑوں میں چاء اور گرمیوں میں موسم کے مناسب حال شربت وغیرہ علاوہ دو وقت کے کھانے کے برابر پیتے ہیں۔ کھانا بھی کم از کم ان کے لائق تو بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ کہاں پندرہ روپے میں کل ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ یا اب بیس روپے صرف کھانے اور روزمرّہ کی چھوٹی موٹی ضروریات کے لیئے علیحدہ ہیں۔ دوسرے اختری بیگم کا انتظام اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی خوبی کہ دام تو کم خرچ ہوں۔ اور چیز عمدہ سے عمدہ تیار ہو جائے۔ مثلاً اس نے گوشت میں ڈالنے کو لوکی منگائی۔ اس میں سے ایک ذرا سا ٹکڑا بچا لیا۔ دوسرے روز دو پیسے کا دہی لے کر لوکی کا رائتہ بنا لیا۔ تین چار دن ہر ترکاری میں سے تھوڑا تھوڑا بچا کر

ایک دن دیوانی ہانڈی پکالی۔ بچی بچائی ترکاری بھی ٹھکانے لگ گئی
اور مفت میں ایک مزیدار ہنڈیا تیار ہو گئی +

گرمیوں میں چٹنی کے لئے پیسے کی کیریاں اور پیسے کی ہری مرچ
پودینہ منگایا۔ روز ایک کیری چھیل کر ابال لی۔ اور مل کر ذراسی شکر نمک
اور ہری مرچ پودینہ کتر کر ملا دیا۔ نہایت خوش ذائقہ چٹنی کی چٹنی سالن
کا سالن تیار ہو گیا۔ پاؤ بھر سوجی یا میدہ بھون کر رکھ چھوڑا۔ کسی دن
دو کیریاں چھیل کاٹ کر چمچہ بھر گھی میں تلیں۔ ذراسی شکر کے شربت
میں ڈال کر چمچہ بھر سوجی یا بھنا ہوا میدہ ڈال دیا۔ اور تازہ شکرانبہ
تیار کر لیا۔ مہینے بھر پیچھے جنس اور مصالحہ وغیرہ میں سے جو جو چیز بچ
رہی اتنی ہی دوسرے میں وہ چیزیں کم منگائیں۔ اور جو دام بچے اس
میں گنجائش کے مطابق کوئی چٹنی اچار مربہ یا حلوا تیار کر لیا۔ یا وہ
زمانہ تھا۔ کہ اگر کبھی چاء یا شربت کو جی چاہا۔ یا کسی دوست کی خاطر
کرنے اٹھے۔ تو پیسے پیسے دودہ پیسے کی سب چیزیں دودھ شکر چاء
یا کیوڑہ خرید کر لانا پڑتا تھا۔ یا اب ضرورت کی ہر شئے ہر وقت گھر میں
موجود۔ بس رات کو دودھ لیتے آئے۔ چاء کا بنڈل اور شکر مہینے پر
آجاتی ہے۔ گرمیوں میں ایک ایک ادھا عرق کیوڑہ بیدمشک اور
گلاب کا آجاتا ہے۔ وقت پر برف آئی۔ اور جس چیز کا چاہا شربت
تیار کر لیا۔ جاڑوں میں خشک میوہ۔ انڈے۔ زعفران۔ دار چینی وغیرہ
ہر قسم کی چیزیں موجود رہتی تھیں۔ تخت کے صاف ستھرے فرش پر
اجلے دسترخوان پر کھانا کھایا۔ پاس ہی کوری صراحی میں ٹھنڈا پانی

لہ اس میں ہر قسم کی ترکاریاں اور ساگ ڈالے جاتے ہیں۔ اور مزیدار چیز ہوتی ہے۔

اور مراد آبادی منجھا دُھلا چمکتا ہوا گلاس رکھا ہے۔ تخت کے کونے پر قلعی دار لوٹا اور نیچے سیلابچی رکھی ہے۔ لوٹے کے پاس ہی صابون دان ہے۔ اور تخت کے قریب ہی کھونٹی پر صاف تولیہ پڑا ہے۔ لوٹے میں حسب موسم ٹھنڈا یا گرم پانی۔ کھانا کھا چکے۔ تو وہیں ہاتھ دھوئے صاف ستھرا پاندان جھمکتا ہوا خاصدان قرینے سے رکھا ہے۔ جس میں خوش ذائقہ بنے ہوئے پان خوشبودار تمباکو اور الائچی موجود ہے۔ گرمیوں میں چھت میں فرشی پنکھا لگا ہوا ہے۔ جس کی خوب صورت جھالر کمرے کی سجاوٹ کو دوبالا کر رہی ہے۔ محلے کے آوارہ گرد لڑکوں میں سے کسی ایک کو گرمیوں میں پیشہ روز دے کر اس کام پر مامور کر لیا جاتا ہے۔ کہ دو گھنٹے دوپہر کو پنکھا جھل دیا کرے۔ خاں صاحب پنکھے کے نیچے کھانا کھا کر آرام فرماتے ہیں۔ بھلا کہاں خاں صاحب بے چارے کے پہلے حالات اور کہاں یہ تکلفات۔ ان کے لئے تو واقعی دُنیا میں جنت اُتر آئی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہیں اپنی حالت پر دلی تاسف تھا۔ اور ہر وقت بیوی کے سامنے ایک شرمندگی سی محسوس کرتے تھے۔

حسن اتفاق سے اس مکان میں آنے کے بعد دوسرے ہی مہینے اس محلے میں کسی دردمند قوم نے ایک نائٹ[1] اسکول قائم کیا جس میں محلے کے بہت لوگ داخل ہوئے۔ خاں صاحب کو بھی ولولہ اُٹھا۔ شرماتے شرماتے بیوی سے صلاح لی۔ اس نے نہایت خوشی کے ساتھ ان کی رائے کی تائید کی۔ اب خاں صاحب آٹھ بجے آ کر

[1] یعنی رات کا اسکول۔ جس سے بڑی عمر کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔

کھانا کھاتے اور ساڑھے آٹھ بجے اسکول چلے جاتے۔ دس بجے آکر سو رہتے۔ اور تھوڑا بہت کام دوپہر کی چھٹی میں کر لیا کرتے۔ چھٹپن میں انھوں نے قرآن شریف پڑھا تھا۔ اور اسی کی مدد سے تھوڑی بہت اُردو بھی پڑھ لیتے تھے۔ اب چھ مہینے میں بہت اچھی طرح لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ اس کے بعد بیوی نے انگریزی کی صلاح دی۔ اور ان کے پڑوس میں ایک منشی پانچ روپیہ ماہوار پر انگریزی اور حساب سکھانے پر راضی ہوگئے۔ روز رات کو ایک ڈیڑھ گھنٹے وہ انہیں پڑھاتے۔ سال بھر میں دو تین کتابیں ختم ہو گئیں۔ اور حساب میں بھی کافی مہارت ہوگئی۔ ادھر بیوی بھی برابر اپنے کام میں مصروف تھیں۔ اور ان کو اوسطاً بیس روپے سلائی میں، پچاس روپیہ ماہوار کٹ پیس کے کپڑوں اور دوسرے سامان دستکاری میں مل جاتے تھے۔

شروع شروع تو انھوں نے اپنی حیثیت درست کرنے میں بیس روپے ماہوار صرف کیا۔ اور مشینیں جمع کرتی رہیں۔ چار مہینے میں ایک سَو چالیس جمع کئے۔ اور دس اَور ملا کر ڈیڑھ سَو کی ایک اَور مشین خرید لی۔ کیونکہ اب ان کی شاگردیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ اور ایک مشین کسی طرح کافی نہ تھی۔ چار مہینے پچاس پچاس جمع کرکے ایک جمنا پاری بھینس خریدی۔ جو دس سیر دودھ روزانہ دیتی تھی۔ لڑکیاں اس کی سانی وغیرہ کرا دیتیں۔ دودھ صرف آدھ سیر اپنے خرچ کو رکھ کر باقی سب حلواتی کو دے دیا جاتا۔ اور روز کے روز اس کی قیمت دو روپے چھ آنے وصول کر لی جاتی جس میں سے بارہ آنے روز اس کے کھانے

میں خرچ ہو جاتے۔ اور باقی ایک روپیہ دس آنے جمع ہوتے رہتے۔
اپندھن کی بھی بھینس کے آجانے سے بہت کفایت ہو گئی۔ محلے کی
ایک غریب عورت تھپائی پر اُپلے تھاپ دیا کرتی۔ اس طرح کہ آدھے
وہ لے لیتی۔ اور آدھے اختری کے ہوتے۔ اس طرح کم و بیش پچاس
روپے مہینہ بھینس سے بھی وصول ہونے لگا۔

یہ سب کچھ ہوا۔ مگر اب تک اختری نے زیور کی قسم سے ایک نا
بھی نہیں بنوایا تھا۔ پھوپی کو بڑی شکایت تھی۔ کہ اختری بڑی فضول
خرچ ہے۔ خدا نے اتنا کچھ دیا۔ مگر اس اللہ کی بندی نے ایک پیسہ
رکھنا نہ جانا۔ اور کوئی ہوتی۔ تو اب تک سر سے پیر تک گوندنی کی طرح
گہنے میں لدجاتی۔ اس کا دکھڑا اکثر اُستانی جی سے بھی روتیں۔ وہ
سمجھاتیں۔ کہ بوا اختری بڑی سمجھ دار لڑکی ہے۔ تم نے تو اس کی قسمت
پھوڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اگر خدا اُسے اتنی عقل نہ
دیتا۔ تو اب تک فاقے کر کر کے مر گئی ہوتی۔ یہ اس کا کہنا بالکل سچ ہے
کہ ابھی میرے پاس اتنا روپیہ کہاں ہے۔ کہ زیور میں بے کار کر کے
ڈال دوں۔ یہ تو اُن لوگوں کو زیبا ہے۔ جن کا روپیہ اتنا وافر ہو کہ
ہر طرح کام میں آکر پھر بھی بچ رہے۔ سچی بات یہ ہے۔ کہ روپیہ روپے
کو کھینچتا ہے۔ بشرطیکہ ہم اچھے کام میں لگائیں۔ اب تم ہی دیکھو۔
کہ اگر وہ مشین نہ لیتی۔ تو کس طرح اس کا کام ترقی کرتا۔ دو سَو
روپے کو اس نے بھینس لی۔ جس سے پچاس روپے ماہوار وصول
ہو جاتا ہے۔ تم ہی انصاف کرو۔ کہ اگر وہ اس دو سو کا زیور بنوا لیتی
تو وہ کتنا دودھ دیتا۔ باقی رہا پہننا۔ اوڑھنا اور حیثیت کے لائق

گھر کو سجانا۔ یہ آج کل کا فیشن ہے۔ اور اس نے انسان کی عزت ہوتی ہے۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ بیوی تمہارے پاس زیور کے شو کا ہے مگر آیا گیا یہ ضرور دیکھتا ہے۔ کہ بیوی کا گھر اور کپڑا لتہ کس حیثیت کا ہے اگر زیور سینکڑوں کا لاد کر کوئی بیوی میلی کچیلی اور پھٹے حالوں رہے گی گھر نا صاف اور ضرورت کی چیزوں سے خالی اور ٹوٹے پھوٹے اسباب سے بھرا ہو گا۔ تو کوئی عزت لوگوں کی نظروں میں نہ ہو گی۔ تمہارے داماد کی کل پندرہ روپے تنخواہ ہے۔ مگر ماشاء اللہ بیوی کے سلیقے اور محنت سے وہ رونق نظر آتی ہے۔ جو سو سوا سو والوں کو بھی نصیب نہیں۔ سچ پوچھو تو اختری سیکڑوں میں ایک لڑکی ہے۔ اور ہزار آفرین ہے۔ اس کی ہمت کو۔ مگر شاباش ہے۔ تم کو کہ پھوپی ہو کر بجائے اس کی تعریف کرنے کے اُلٹا اسے الزام دیتی ہو۔ گھبراتی کیوں ہو خدا وہ دن بھی کرے گا۔ کہ تمہاری اختری سر سے پیر تک سونے میں پیلی نظر آئے گی۔ مگر صبر کرو اتنی جلدی کیا ہے۔ تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی ہو۔

پھوپی یہ تقریر سُن کر کچھ دنوں کو خاموش ہو جاتیں۔ مگر چند روز بعد پھر انہیں زیور کی ہڑک اُٹھتی۔ اور دوبارہ اُستانی جی کو لیکچر دینا پڑتا۔ اسی طرح خدا خدا کر کے سال ختم ہوا۔ اور اب خدا کی عنایت سے اختری کی آمدنی میاں کی تنخواہ کے علاوہ اوسطاً ایک سو بیس روپے ماہوار تھی۔ اب اختری نے میاں کو صلاح دی۔ کہ اب تم نوکری کو استعفا دے دو۔ اور جتنا وقت اس میں صرف ہوتا تھا پڑھنے میں لگایا کرو۔ خدا کی عنایت سے اب ہماری آمدنی کافی ہے

پندرہ روپے اگر تمہارے کم ہو جائیں گے۔ تو کوئی زیادہ نقصان نہ ہوگا۔
بلکہ میں تو یہاں تک چاہتی ہوں۔ کہ اب منشی جی کو الگ کر کے ایک
اچھا قابل ماسٹر پندرہ بیس روپے تنخواہ پر رکھ لو۔

خاں صاحب کو پہلے تو ذرا تامل ہوا۔ مگر بیوی کی رائے سے
اختلاف کرنا اب ان کے لئے بہت مشکل تھا۔ اس لئے راضی ہو گئے۔
بیس روپے ماہوار پر ایک انٹرنس پاس ماسٹر مقرر ہوئے۔ جو روز
دو گھنٹے پڑھاتے۔ اور باقی تمام وقت خاں صاحب خود مطالعہ میں
مصروف رہتے۔ چالیس روپیہ ماہوار گھر کے اخراجات میں صرف
ہوتا۔ اور ساٹھ روپے جمع ہوتے۔ سال بھر اس طرح ہی گزرا۔ اور
اب اختری کے ہاتھ میں سات سَو بیس روپے کی رقم ہو گئی۔ اب
اس نے اُستانی جی سے مشورہ لیا۔ کہ اس کا کیا مصرف بہتر ہوگا۔
ادھر خاں صاحب نے بھی سال بھر کی سخت محنت سے اپنی استعدادُ
میں کافی سے زیادہ ترقی کر لی تھی۔

ہمارے ناظرین کو تعجب ہوگا۔ کہ اختری نے آخر کیا سوچ کر
اپنے بڈھے طوطے کی نوکری چھڑوا کر پڑھنے بٹھایا تھا۔ اب اس راز
کے بھی فاش ہونے کا وقت آگیا۔ مدت ہوئی اس نے ایک اخبار
میں بمبئی کے ایک مدرسے کا حال پڑھا تھا۔ کہ وہاں ٹیلر ماسٹری کا
کام اعلیٰ پیمانے پر سکھایا جاتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے۔ کہ کم از کم مڈل
تک کی لیاقت پہلے سے ضرور ہونی چاہئے۔ اختری کے دل میں اُسی
دن سے یہ شوق دامنگیر تھا۔ کہ کسی طرح خاں صاحب کو اس دھرّے
پر لگایا جائے۔ اب اس معاملے میں بھی اس نے اُستانی جی سے مشورہ

لیا۔ انہوں نے کہا۔ بوا پہلی بات کا جواب تو یہ ہے۔ کہ اگرچہ مکان سے پہلے تمہیں زیور کا شوق نہ کرنا چاہئے تھا۔ مگر چونکہ ماشاء اللہ تمہاری بڑھتی آمدنی ہے۔ آیندہ خدا کی ذات سے بہت کچھ جمع ہو جانے کی اُمید ہے۔ اور یہ رقم مکان کے لئے کافی بھی نہیں۔ دوسرے تمہاری پھوپی کو بھی تمہیں بالکل ننگا بوچا دیکھ کر بہت صدمہ ہوتا ہے۔ اس لئے میں تمہیں یہی صلاح دوں گی۔ کہ اس روپے کا تم زیور بنوالو۔ سات سَو میں آج کل کے فیشن کے لائق اچھا خاصہ زیور بن جائے گا۔ یہ تو میں کبھی صلاح نہ دوں گی۔ کہ تم جھومر جُھلنیاں بالی پتّے۔ اور کرن پھول جُھمکے بنواؤ۔ جن کی نہ کانوں کو سہار نہ آج کل کچھ قدر۔ اگر مجھ سے پوچھتی ہو۔ تو ایک تو تم نکلس کوئی تین سَو کا بنوالو نہ بہت بھاری نہ بہت ہلکا۔ پھر خوبی یہ کہ صرف یہی ایک زیور گلے اور سینے کی زینت کے لئے کافی ہے۔ اور اسی کا آج کل رواج ہے۔ باقی رہے چار سو اس میں سے دو سَو کے ہاتھوں کے کسی خوب صورت وضع کے کڑے بنوالو۔ باقی دو سَو میں دو تین جوڑ بندے انگوٹھیاں اور بروچ وغیرہ بنوالو۔ بس یہی آج کل کے فیشن کی چیزیں ہیں۔ اور انہیں کا عام طور پر رواج ہے۔ پیروں میں اول تو آج کل کچھ پہننے کا دستور نہیں۔ دوسرے چاندی کے لچھے وغیرہ تمہارے پاس ہیں ہی۔ خدا دے۔ تو اب سونے کے بنوا لینا۔ اور دوسری بات کا جواب یہ ہے۔ کہ اس اسکول کی میں نے بھی بہت تعریف سُنی ہے۔ بلکہ یہاں تک سُنا ہے۔ کہ یہاں کے پاس شدہ لوگ ڈیڑھ ڈیڑھ سَو روپے ماہوار تک

تنخواہیں کارخانوں میں پا رہے ہیں۔ اور اگر اپنا کارخانہ کھول دیں۔ تو کیا پوچھنا۔ اگر خاں صاحب راضی ہوں۔ تو بسم اللہ فوراً ان کو روانہ کر دو۔ میرا خیال یہ ہے۔ کہ پچاس روپے ماہوار بھی ان کو بھیج کر تم اپنا خرچ بآسانی پورا کر لو گی ٭

بگڑی بن جائے گی اب فضلِ خدا ہوتا ہے

اختری نے وہ اخبار جو برسوں سے نہایت احتیاط کے ساتھ رکھ چھوڑا تھا میاں کو دکھایا۔ اور صلاح مشورہ ہو کر اسی دن اسکول کے قواعد منگانے کے لئے خط لکھ دیا گیا۔ اور اسی مہینے کے اندر خاں صاحب بمبئی روانہ ہو گئے۔ اب پچاس روپیہ ماہوار ان کو جانے لگا۔ بیس میں اپنا خرچ پورا کرتی۔ اور پچاس روپے برابر جمع ہوتے رہتے۔ خاں صاحب کو برابر خطوں میں اختری کی یہی تاکید ہوتی۔ کہ تم اپنا مقصد صرف یہ مت سمجھو۔ کہ تمہیں کام سیکھ کر واپس آ جانا چاہیئے۔ بلکہ مختلف کارخانوں اور فرموں میں جا جا کر اپنی معلومات میں اضافہ کرو۔ اور سمجھو کہ تجارت کو اعلیٰ پیمانے پر چلانے کے گر کیا کیا ہیں۔ ہماری قوم آج کل جس پستی کی حالت میں مبتلا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ تجارت جو ہمارے اسلافؔ کے عروج کا باعث ہوئی تھی۔ اس کو ہم نے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔ اور ملازمت کو اپنی ترقی کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ میں چاہتی ہوں۔ کہ اب ہم اس غلطی میں نہ پڑیں۔ اور جس کام کو میں نے شروع کیا ہے۔ تم اس کو بڑھا کر اعلیٰ پیمانہ پر لے آؤ۔ یہ زمانہ جو تم کام سیکھنے میں صرف کرو گے۔ اس کے لئے کافی نہ ہو

ؔ بزرگوں

توتم اس کے بعد سال چھ مہینے کسی انگریزی کارخانے میں ملازمت کر کے تجارت کے ضروری اصول سیکھو۔ اور بعد میں انہیں پر عمل پیرا ہو کر اپنی تجارت کو فروغ دو ۔

خاں صاحب جس مقصد کو دل میں لے کر گئے تھے۔ رات دن اس کی تکمیل میں مصروف رہتے۔ اور بیوی کے اس قسم کے خطوط حوصلہ اور شوق کو زیادہ کرنے کے لئے سونے پر سہاگے کا کام دیتے۔ الغرض سال بھر ان کی محنت ٹھکانے لگی۔ اور نہایت کامیابی کے ساتھ انہوں نے امتحان پاس کیا۔ لیکن چونکہ کام کی مشغولیت سے انہیں اتنی فرصت نہ ملتی تھی۔ کہ تجارت کے متعلق کچھ مفید معلومات بہم پہنچا سکیں۔ لہٰذا دونوں میاں بی بی کی صلاح سے یہ طے ہوا۔ کہ ابھی ایک سال اور انہیں وہیں قیام کرنا چاہئے۔ اور کسی مشہور انگریزی کمپنی میں ملازمت اختیار کر کے وہاں کے اندرونی نظام سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کرنی چاہئے۔ اگر خاں صاحب ذرا صبر اور کوشش سے کام لیتے۔ تو انہیں زیادہ تنخواہ کی ملازمت مل سکتی تھی۔ مگر ان کی اصل غرض تو ملازمت سے یہ تھی۔ کہ تجارت کے متعلق معلومات حاصل کریں نہ کہ روپیہ کمانا۔ اس لئے انہوں نے ایک پچاس روپے ماہوار کی جگہ جو سر دست خالی تھی۔ حاصل کر لی۔ اور سال بھر تک بغور معائنہ کرتے رہے۔ کہ کس طرح تجارت کے ذریعے انگریزی کمپنیاں سادہ لوح ہندوستانیوں کی جیبیں خالی کرا رہی ہیں۔ اب انہوں نے گھر سے خرچ منگانا بند کر دیا تھا۔ اور اپنی تنخواہ میں بخوبی گزر کرتے تھے۔ سال بھر میں جب یہ تجارت کے نظم و نسق سے پورے

طور پر واقف ہو گئے۔ تو واپسی کی ٹھہرائی۔ اور بیوی کو لکھا۔ کہ تم اگر کچھ روپیہ بھیج سکو۔ تو دُکان کے لئے ضروری سامان یہاں سے خرید لوں۔ کیونکہ یہاں ہماری ضروریات کی تمام چیزیں بکفایت ملتی ہیں۔

اختری نے دو سال میں پہلے سال بحساب پچاس روپے ماہوار چھ سَو روپیہ اور دوسرے سال بحساب سَو روپیہ ماہوار کل اٹھارہ سَو روپیہ جمع کر رکھا تھا۔ اس میں سے آٹھ سَو فوراً میاں کو روانہ کر دیا۔ اور لکھ دیا۔ کہ ابھی ایک ہزار میرے پاس اَور ہے۔ اگر ضرورت ہو تو بھیج دوں۔ مگر خاں صاحب نے اتنے ہی کو کافی سمجھا۔ اور دو مشینیں تین سَو کی اور کچھ قینچیاں۔ استریاں وغیرہ ضروری اوزار پچاس روپے میں خرید لئے۔ اور باقی کا کپڑا لیا۔ اور کپڑے کے چند تاجروں سے مل کر وقتاً فوقتاً کپڑا منگانے کا معاملہ طے کیا۔ اور وطن کو روانہ ہوئے۔
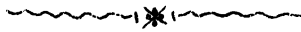
اختر اینڈ کو

یہاں آکر اُنہوں نے نہایت شان کے ساتھ اپنی چاہیتی بیوی
اختری بیگم کے نام پر اختر اینڈ کو کے نام سے اپنی دُکان کھولی۔
پارفٹ وولائٹ وے اور دوسری ہندوستان کی مشہور کمپنیوں کی
لسٹیں منگا کر اپنے ہاں بھی ٹھیک اسی قسم کا سامان تیار کرایا۔ اور
قیمتیں اس سے آدھی رکھیں۔ کیونکہ ان کے یہاں اعلیٰ درجہ کا
یوروپین اسٹاف تھا۔ نہ دوسرے اس قسم کے بڑھیا مصارف جن
کے لئے خواہ مخواہ انہیں ٹھگ بدیا سے کام لینا پڑتا۔ صرف دو تین
معمولی درزی اُنہوں نے پندرہ پندرہ بیس بیس روپے ماہوار پر رکھ
لئے تھے۔ انہیں سے اپنی نگرانی میں عمدہ سے عمدہ کام تیار کرانے
اور کچھ اختری بیگم خود کرتیں اور اپنی شاگردوں سے کراتیں۔ چونکہ خان
صاحب خود ماہر فن تھے۔ کام بہتر سے بہتر ہوتا۔ اب انہوں نے نہایت
بے خوف ہوکر اُردو انگریزی اخبارات میں اشتہار دیا۔ کہ پانچ سَو روپیہ
انعام اس شخص کو دیا جائے گا۔ جو ہماری دکان کے سامان کو کسی طرح
بھی بڑی سے بڑی کمپنی کے سامان سے کمتر ثابت کردے۔ اور لطف
یہ کہ قیمت ہر چیز کی ہمارے یہاں ان کمپنیوں سے آدھی ہے۔ شوقین
مگر نادار جنٹلمین بھی اپنے شوق کو بآسانی پورا کرسکتے ہیں۔ اُمراء اور

رؤسا ہمارے یہاں سے بکفایت فینسی سامان خریدیں۔ اور اپنے مفلس ملک کا روپیہ باہر نہ جانے دیں ؂

اس اشتہار کے نکلتے ہی آزمائش کے لئے ان کے سامان کی مانگ آنی شروع ہوئی۔ اور جب ان کی صداقت کی تصدیق ہوگئی۔ تب تو پھر گاہکوں کی کثرت نے انہیں مجبور کر دیا۔ کہ زنانہ و مردانہ اسٹاف میں خاطر خواہ اضافہ کریں۔ ہندوستان کی بڑی بڑی نمائشوں میں ان کی دُکان جاتی۔ اور سونے چاندی کے تمغے اور سارٹیفکٹ حاصل کرتی۔ چند سال میں ایک مشہور و معروف کمپنی کی حیثیت حاصل کرلی ہر سال بڑی دھوم دھام سے اس کی سال گرہ منائی جاتی۔ اور اس موقع پر علاوہ قیمتوں میں معقول رعایت ہونے کے خاں صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ اپنی جیب خاص سے دو دو طالب علم اور طالبات کو معقول وظائف دے کر صنعتی اسکولوں میں بھیجتیں ؂

دس برس یونہیں گزر گئے۔ اور ان دونوں نیک نہاد میاں بیوی نے ہزاروں روپیہ پیدا کرلیا۔ اور اس چشمۂ فیض سے بیسیوں تشنگانِ علم و ہنر کی پیاس بجھی۔ بہت سے فاقہ مست خوش حال نظر آنے لگے۔ بیسیوں بیوائیں ناداری کی مصیبت کو خیرباد کہہ کر آج اُن کی بدولت آسودہ حال نظر آتی ہیں۔ اور اپنی اور اپنی اولاد کی نہ صرف کفالت کے قابل ہیں۔ بلکہ اس کو علم و ہنر کے زیور سے آراستہ کرکے افرادِ قوم میں ایک خوش حال اور کارآمد جماعت کا اضافہ کر رہی ہیں ؂

نقرئی جوبلی اور خاں صاحب کی تقریر

آج اس کمپنی کی دسویں سال گرہ اور نقرئی جوبلی ہے۔ خاں صاحب کی شاندار کوٹھی اور خوش نما باغ اپنی آراستگی سے چوتھی کی دلھن کو شرما رہے ہیں۔ برقی روشنی نے رات میں دن کا سماں پیدا کر دیا ہے۔ مہمانوں کی شاندار گاڑیوں کی باغ کے پھاٹک سے لے کر سڑک تک قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ زنانہ و مردانہ ہال کھچا کھچ مہمانوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جن کی رنگارنگ نفیس پوشاکوں سے کوٹھی کی رونق کو اَور بھی چار چاند لگ گئے ہیں۔ غرباء و مساکین کے لئے باہر وسط باغ میں ایک بڑا شامیانہ نصب ہے۔ اور اسی طرح اندر صحن میں لگا ہوا ہے۔ یہ وہ محفل نہیں۔ جہاں امیروں کی آؤ بھگت ہو۔ اور غریبوں کو دھکے ملیں۔ نہیں۔ بلکہ جو آتا ہے۔ صاحب خانہ نہایت خندہ پیشانی سے اس کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اور باہر خاں صاحب اور اندر ان کی بیوی ان غریبوں کی خاطر و تواضع میں مصروف ہیں۔ عمدہ سے عمدہ گرم کھانے ان کے آگے اپنے ہاتھوں لا لا کر چن رہے ہیں۔ اور ان کی دلی دُعاؤں سے مالا مال ہو رہے ہیں۔ باقی تمام مہمان آپس کی خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ ادھر سے فرصت پاکر یہ نیک نہاد میزبان اپنے معزز مہمانوں کی طرف متوجہ

ہوئے۔ اور اندر باہر کھانا کھلا کر خاں صاحب نے حسب ذیل تقریر شروع کی۔ (چونکہ زنانہ اور مردانہ ہال ملا ہوا تھا۔ اس لئے اندر اور باہر دونوں طرف ان کی آواز برابر پہنچ رہی تھی)۔

میرے معزز مہمانو! بھائیو اور بہنو! سب سے اوّل میں آپ کی اس تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جو آج آپ نے ہماری خوشی میں شرکت فرمانے کے لئے گوارا کی۔ اس کے بعد میں سب صاحبان سے اجازت چاہتا ہوں۔ کہ آج آپ کو اپنے مختصر حالات زندگی سناؤں۔ اگرچہ آپ صاحبان کی سمع خراشی اور وقت عزیز کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ لیکن چونکہ ہمارے بہت سے بھائی بہنوں کے لئے میرا قصّہ ایک سبق آموز قصّہ ہے۔ اس لئے میں اس کو سنانے کی جُرأت کرتا اور سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں۔ میں چونکہ اسی شہر کا باشندہ ہوں۔ اس لئے میرے شروع کے حالات زندگی آپ صاحبان سے مخفی نہیں ہیں۔ میں نے بچپن میں والدین کے لاڈ پیار اور اپنی بدشوقی سے علم و ہنر کی طرف سے جو بے توجہی اختیار کی۔ اس کا خمیازہ مجھے جوانی آتے ہی بھگتنا پڑا۔ اور اگر میری شادی ایک پڑھی لکھی اور سمجھ دار لڑکی سے نہ ہوتی۔ تو تمام عمر شاید مجھے انہیں مصائب کا سامنا کرکے آخر کار بہت جلد قبر کا گوشہ سنبھالنا پڑتا۔ میری طرح نہ معلوم کتنے مفلس بے علم و ہنر نوجوان آج در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ جنہیں کوئی رہبر نہیں ملتا۔ کہ ہاتھ پکڑ کر ان کو ترقی کے زینے پر لا کھڑا کرے۔ میں خوش نصیب تھا۔ کہ میری بیوی میری رہنمائی کے لئے خضر راہ ثابت ہوئی (اس کے بعد خاں صاحب نے شادی سے

لے کر اس وقت تک کے حالات زندگی مختصر الفاظ میں کہہ سُنائے) اور پھر کہا۔ کہ ان حالات کو سُن کر آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا۔ کہ میں نے اپنی بیوی کو اپنا خضر راہ کہا۔ تو غلط نہیں کہا۔ آپ لوگوں کو تعجب ہو گا۔ کہ ایک عورت نے کس طرح اتنی عقل پائی۔ کہ میری رہنمائی کر سکے۔ تو معزز حاضرین وہ بھی ایک عورت ہی کا وجود ہے۔ جن کو میری بیوی کی اُستادی کا شرف حاصل ہے۔ میری بیوی نے کسی اسکول یا مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی۔ بلکہ گھریلو تعلیم اپنے ایک پڑوس کے گھر میں ایک شریف اُستانی سے حاصل کی۔ جو محض دوسروں کی بھلائی کے خیال سے اپنے ذمے یہ خدمت آج تک لئے ہوئے ہیں۔ کہ اپنے محلّہ کی لڑکیوں کو اُردو اور قرآن شریف پڑھا دیا کرتی ہیں۔ انہیں سے میری بیوی نے بھی اتنی ہی تعلیم حاصل کی۔ شادی کے بعد سے ہماری حالتِ زار پر رحم فرما کر انہوں نے میری بیوی کو سلائی کٹائی کا کام بھی خود ہی سکھایا۔ اور اس دن سے لے کر آج تک ہم دونوں کو اپنے مفید مشوروں سے مالامال فرماتی رہتی ہیں۔ اور سچ پوچھئے۔ تو یہ انہیں کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ کہ آج آپ اس ناچیز کو اس حالت پر دیکھ رہے ہیں۔ سچ یہ ہے۔ کہ ہم دونوں اگر اپنی کھال کی جوتیاں بنا کر بھی اُستانی صاحبہ معظمہ کو پہنا دیں۔ تو ان کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ میرے قصّہ سے آپ کو معلوم ہوا ہو گا۔ کہ ہماری قوم نے جو عورت کو ناقص العقل کا خطاب دے رکھا ہے۔ اور عام طور پر یہ مشہور ہے۔ کہ عورت کی رائے پر چل کر ہمیشہ انسان نقصان اُٹھاتا ہے۔ اس کی اصلیت کیا ہے۔ اسی جنس ناقص العقل کے مشورے پر کاربند ہونے سے آج آپ مجھے اس حالت میں دیکھ

رہے ہیں۔ جس کا کم از کم مجھے تو خواب میں بھی وہم و گمان نہ تھا۔
مجھے یہ دیکھ کر نہایت صدمہ ہوتا ہے۔ کہ ہمارے سامنے ترقی کا اتنا وسیع میدان موجود ہونے کے باوجود ہماری قوم کیوں اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اور اُسے نہیں پاتی۔ میدانِ تجارت وہ شاہراہ ترقی ہے۔ جس پر چل کر ہمارے اسلاف نے وہ عروج حاصل کیا۔ جس کی مثال دوسری قوموں میں بمشکل ملتی ہے۔ یا اب ہمارے ادبار کی انتہا یہ ہے۔ کہ ہم نے قطعی اس راستے کو فراموش کر دیا۔ اور ملازمت کو اپنے لئے معراج کمال سمجھ رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہزاروں کی تعداد میں طلباء ہر سال ملکی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔ اور روزگار کی تلاش میں سرگرداں پھرنے لگتے ہیں۔ وجہ یہ کہ جس قدر کلرکوں کی ہمارے ملک کو ضرورت ہے۔ وہ پوری ہو کر بھی سیکڑوں کی تعداد میں باقی رہ جاتے ہیں۔ اب بتلایئے۔ کہ ان کے لئے ملازمت آئے تو کہاں سے؟ باقی رہے صنعت پیشہ حضرات تو وہ کچھ ایسے پُرانی لکیر کے فقیر ہیں۔ کہ جو کام وہ زمانہ سلف سے کرتے آئے ہیں۔ اس سے ایک انچ آگے بڑھنا نہیں جانتے۔ اُن کو اس سے کوئی بحث نہیں۔ کہ اب زمانے کا رُحجان کس طرف ہے۔ اور ہمیں بھی اسی طرف جانا چاہئے۔ جس طرف دُنیا کا رُحجان ہے۔ بقول شخصے۔ کہ

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

ہمارے لیڈر اور علماء گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے ہیں۔ کہ ہمارے نوجوان تقلید یورپ میں اندھے ہو رہے ہیں۔ اپنا روپیہ غیر ملکوں کی صنعت پر قربان کر کے تباہ ہو رہے ہیں۔ مگر اتنا کوئی نہیں سوچتا۔ کہ

اس میں صرف ہمارے نوجوانوں کی ہی خطا نہیں۔ قدرتی بات ہے۔ کہ بادشاہِ وقت کی ہر ادا رعایا میں پسندیدہ نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ پھر انگریزوں کا اقبال تو اس قدر زوروں پہ ہے۔ کہ وہ قومیں جو برسوں ان سے برسر پیکار رہی ہیں۔ آخر کار ان کی طرز معاشرت اور تمدن کو اپنے لئے باعث فخر سمجھ رہی ہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ٹرکی کو دیکھئے۔ ان کے ہاتھوں کیا کچھ مصیبتیں نہیں جھیلنی پڑیں۔ اور وہی مصطفےٰ کمال پاشا جنہوں نے کتنی زبردست قربانیوں کے بعد اپنے ملک کو بچایا ہے۔ آج جبراً اپنے ملک میں انگریزی لباس اور ٹوپی کو رواج دے رہے ہیں۔ اور ایک ٹرکی ہی پر کیا موقوف ہے۔ ایران اور کابل جیسی خود مختار اسلامی سلطنتیں بھی یہی رویّہ اختیار کر رہی ہیں۔ تو ہندوستان بیچارہ کس گنتی میں ہے۔ جو خاص ان کی رعایا ہے۔ اس نے اگر بحیثیت ان کی رعایا ہونے کے ان کی اندھا دُھند تقلید کی تو کون سی تعجب کی بات ہے۔ ہندوستان کے لئے مفید ہو یا مضر یہاں اس سے بحث نہیں۔ مگر یہ ضرور ہے۔ کہ اب یہ تقلید مغرب کا سیلاب کسی کے روکے رُکنے والا نہیں۔ البتہ اگر اپنے ملک کا روپیہ ملک کے اندر رکھنا ہے۔ تو یہ ہمارے صنعت اور تجارت پیشہ اصحاب کا فرض ہے۔ اپنے میں بھی وہی فضا پیدا کریں۔ جو ہمارے ملک کو ممالک غیر کی طرف کھینچے لئے چلی جاتی ہے۔ مُلکی رُجحان کو دیکھ کر اسی کے مطابق سامان تیار کیجئے۔ تجارت کے طریقے اگر آپ بھول گئے ہیں۔ تو اپنے انگریز بھائیوں سے سیکھئے۔ اور انہیں طریقوں پر آپ بھی عمل پیرا ہو جایئے۔ جو ہمارے ملک کے نوجوانوں کی آنکھوں میں خیرگی پیدا کر کے ان

کو بے اختیار اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اگر آپ کو اپنے ملک میں آسودگی پیدا کرنی ہے۔ تو اپنی خیرات کے بیہودہ طریقوں مثلاً لنگر وغیرہ جو آپ لاکھوں روپیہ سالانہ صرف کرتے ہیں۔ اس کو بند کرکے اپنے ملک کے نادار طبقہ کو علم و ہنر کے زیور سے آراستہ کیجئے۔ جتنا روپیہ آپ ہر سال نیاز نذر اور لنگر میں خرچ کرتے ہیں۔ اس کو یکجا کرکے نادار طبقہ کے لئے وظائف مقرر کیجئے۔ اور نہ صرف ایک وقت لوگوں کو کھانا کھلانے میں اپنا سیکڑوں روپیہ برباد کیجئے۔ بلکہ اسی روپے سے مفلسوں کو اس قابل بنائیے۔ کہ وہ نہ صرف اپنا بلکہ اپنے ساتھ دس اوروں کا بھی پیٹ پالنے والے بن جائیں؛

سوچئے تو سہی۔ اگر آپ نے سیکڑوں روپیہ صرف کرکے ایک وقت چند آدمیوں کا پیٹ بھرنے کا ثواب کمایا تو کیا کمایا۔ جب کہ اسی روپے سے آپ وظائف دے کر دو چار آدمیوں کو اس قابل بنا سکتے تھے۔ کہ وہ روپیہ دو روپیہ روز پیدا کرکے اپنے خاندان کو فاقہ کشی کی مصیبت سے بچالیں۔ آج ہمارے ملک کی حالت یہ ہے۔ کہ ایک شخص مرتا ہے۔ تو اس کا پورا خاندان روٹیوں کو محتاج ہو جاتا ہے۔ غریب بیوہ کو روٹی ہی کا ٹھکانہ نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت کیا خاک کرسکتی ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے۔ کہ یتیم بچوں کی ایک بہت بڑی جماعت علم و ہنر سے بے بہرہ رہ کر جوان ہونے پر ملک کے لئے ننگ و عار ثابت ہوتی ہے۔ اگر ہمارے ملک کی خوشحال جماعت صرف اتنا کرے۔ کہ ایسی بیواؤں کی تعلیم کا انتظام کرکے ان کو اس قابل بنادے۔ کہ وہ معلمہ گری۔ ڈاکٹری۔ دایہ گری یا نرسنگ

کا پیشہ اختیار کر کے اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت دے سکیں۔ تو چند سال میں یہی باعث ننگ جماعت ہمارے ملک و قوم کے لئے باعث فخر ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ بدنصیب بھی اس دُنیا میں وہی دل و دماغ لے کر آتے ہیں۔ جو ہم آپ لاتے ہیں۔ مگر محض جلا نہ پانے سے یہ جواہر ریزے مٹی میں مل کر سنگریزے ثابت ہو رہے ہیں۔ آج اگر ملک کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو جائے۔ اور اُن کو بھی پیٹ کی فکر سے آزاد کر کے ترقی کے مواقع دیئے جائیں۔ تو کل کو یہ بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہو کر آپ کی قوم کو چار چاند لگا دیں گے۔ مگر واضح رہے۔ کہ آج کل چونکہ ہنر کی طرف سے ہماری قوم غافل ہے۔ اور علم کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہے۔ اس لئے بازار علم و ہنر میں ہنر کی قیمت بہ نسبت علم کے گراں ہے۔ اس لئے میں یہی صلاح دوں گا۔ کہ علم کو علم کی غرض سے حاصل کیجئے۔ اور ہنر اور تجارت کو ذریعہ معاش بنائیے۔

باقی رہا وہ طبقہ جو اپنی ضعیفی درماندگی یا عوارض کے سبب بالکل اس قابل نہیں ہے۔ کہ کوئی کام کر سکے۔ اس کو ضرور آپ اپنے لنگر خانے کے دستر خوان پر مدعو کیجئے۔ مگر اس کے لئے بھی یہ نہ سمجھئے۔ کہ ایک دو روز کا آپ کا لنگر کا پلاؤ زردہ اور قورمہ قلیہ ان غریبوں کو سال بھر کے لئے غذا کی ضرورت سے بے نیاز کر دے گا۔ نہیں۔ بلکہ دو چار یا دس پانچ دن یہ نفیس کھانے کھا کر بھی سال کے باقی دنوں میں وہ اسی طرح غذا کے محتاج رہیں گے۔ جس طرح کہ ان لنگر کے دنوں میں ہوتے ہیں۔ اس لئے میری مؤدبانہ گزارش آپ سب صاحبان کی خدمت میں یہ ہے۔ کہ لنگر میں جو آپ سیکڑوں روپیہ دو چار دن میں صرف کر دیتے

ہیں۔ اس کو معمولی قسم کے سستے کھانے پکوانے میں سال بھر تک چلائیے۔ اور صرف انہیں غریبوں کو کھلائیے۔ جو بالکل بے دست و پا ہیں۔ اور کوئی کام کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ انہیں کے کنبے کے دوسرے لوگ جو ذرا بھی کسی کام کے قابل ہوں۔ خواہ مرد ہوں یا عورتیں بچے ہوں یا بوڑھے۔ غرض جو بھی کسی کام کے قابل ہو اس کو کسی نہ کسی کام کے قابل بنائیے۔ اس زرّین مقولے کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ "کسی کا پیٹ بھر دینے سے یہ بدرجہا زیادہ بہتر ہے۔ کہ اُسے خود اپنا پیٹ بھرنے کے قابل بنا دیا جائے"۔

غرض اس اتنی دیر کی سمع خراشی کا لُب لُباب یہ ہے۔ کہ عورتوں کو ناقص العقل سمجھ کر مثل ایک مویشی کے ہر قسم کے علم و ہُنر سے بے بہرہ رکھ کر اُن کی پرورش کرنا ہماری انتہائی خود غرضی ہے۔ اور اب اس کا خمیازہ ہم خود یہ اُٹھا رہے ہیں۔ کہ دوسری قوموں کے مقابلے میں ہماری طاقت آدھی بھی نہیں رہی۔ عورتوں کو بھی ایک ذی عقل و ہوش سمجھ کر پڑھائیے لکھائیے۔ اور ان کی مدد سے اپنی طاقت کو بڑھائیے۔ صنعت اور تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنائیے۔ اور زمانے کا رُخ دیکھ کر کام کیجئے۔ خیرات کے بے ہودہ طریقوں کو بند کر کے ایسے طریقے اختیار کیجئے۔ کہ آپ کی قوم میں خیرات لینے والوں کا وجود روز بروز کم ہوتا جائے۔ اور وہی ناکارہ اور باعث ننگ ہستیاں جو آج آپ کی خیرات پر گزر اوقات کر رہی ہیں۔ آگے چل کر اپنی قوم کے لئے باعث صد ناز و افتخار ثابت ہوں۔

آخر میں مَیں دوبارہ آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ نہ صرف

آج کی خوشی میں آپ نے شرکت فرما کر مجھے افتخار بخشا۔ بلکہ اتنی دیر تک میری کہانی اور سمع خراشی کو سُننے کی تکلیف گوارا فرمائی۔ خدا آپ لوگوں کو اس کی جزائے خیر دے۔ اور میرے ناچیز مشوروں پر جو سراسر اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر میں نے دیئے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ؛

اتفاق سے راقمہ بھی اس تقریب میں شریک تھی۔ خاں صاحب کی تقریر نے اس کے دل پر یہ اثر کیا۔ کہ دوسرے ہی روز جاکر اختری بیگم سے ملاقات کی۔ اور ان دونوں کے حالات زندگی کتاب کی صورت میں لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اختری بیگم نے نہ صرف بکمال خندہ پیشانی خاکسار کو اس کی اجازت دی۔ بلکہ اپنا روزنامچہ بھی حوالے کر دیا۔ جس کی مدد سے خاکسار کو اس کتاب کے لکھنے میں کوئی بھی دشواری باقی نہ رہی۔ البتہ ایک سوال ضرور پیدا ہوا۔ وہ یہ کہ جب غیروں کے ساتھ ان دو نو نیک نہاد میاں بیوی نے ہر قسم کے سلوک کئے۔ تو ان کا اپنا خاندان کیوں اس ابر فیض سے محروم رہا۔ اس کا جواب ہمیں یہ ملا۔ کہ خاں صاحب کے برادر مکرم جن کا ذکر شروع میں آچکا ہے۔ اور جو روزگار کی فکر سے برسوں تنگ رہے۔ خاں صاحب کی دُکان پر برابر پچاس روپیے ماہوار پر منیجری کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اور کمپنی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی بھی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ باقی رہیں اختری بیگم کی پھوپی اور دادی وغیرہ تو باپ اور دادی کا تو عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔ ان کی دوسری بیوی یعنی اختری بیگم کی سوتیلی ماں نے دوسرا نکاح کر لیا۔ اپنی لڑکی کی

شادی کر دی۔ اور دو چھوٹے بچوں کو اپنے ہمراہ لے گئیں ٭
اب لے دے کر صرف ایک پھوپی کا دم رہ گیا۔ اختری نے اس وقت جب کہ اس کے ہاں نئی شاگردیں کام سیکھنے بیٹھیں بہت چاہا۔ کہ پھوپی ان کو کام سکھانے میں مدد دیں۔ (کیونکہ ہندوستانی تمام قسم کے کپڑوں کی قطع برید سلائی اور نیز کشیدہ کے کام میں اس کی پھوپی بہت ماہر تھیں) اور اس کا معاوضہ لے لیا کریں۔ مگر ان کی غیرت نے اس بات کو گوارا نہ کیا۔ اور کہا۔ کہ دُنیا یہی کہے گی۔ کہ داماد کی روٹیوں پر آپڑیں۔ آخر مجبور ہو کر اختری کو ایک ترکیب اَور سوجھی۔ اس نے جب اپنے لئے بھینس خریدی۔ اور دیکھا۔ کہ اس سے اس قدر آمدنی ہوتی ہے۔ تو ایک بھینس پھوپی کے لئے بھی منگائی اور کہا۔ کہ لو پھپی یہ بھینس میں نے تمہارے لئے منگائی ہے۔ تم کو اس طرح لینے میں انکار ہو تو تم اس کی آمدنی سے اس کی قیمت مجھے ادا کر دو۔ میں بخوشی لے لوں گی ٭ پھوپی کچھ تامل کے بعد اس پر راضی ہو گئیں۔ اور پچیس روپے مہینہ کر کے آٹھ مہینے میں اس کے دام بھتیجی کو ادا کر دیئے۔ اختری نے دس روپے کا ایک دیہاتی ملازم اس کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کر دیا۔ وہی اس کا کام کرتا ہے۔ اور پھوپی کے اَور سب کام بھی وہی کر دیتا ہے۔ بھینس جب خشک ہو جاتی ہے۔ اختری بیگم خود ہی اسے بدلوا دیتی ہیں۔ اس طرح پھوپی بھی بڑھاپے میں آرام سے بیٹھ کر عبادت الٰہی میں مصروف ہیں۔ اور جو کچھ ان کے پاس ہے۔ اس سے دل کھول کر بھتیجی کی آؤبھگت کرتی ہیں۔ اکثر اس کو بُلا کر اپنے گھر مہمان رکھتی ہیں۔ عید بقر عید

اور دوسرے تہواروں کے موقع پر دُنیا کے دستور کے مطابق اسے دے دلا کر اپنے دل کے ارمان اس بے ماں باپ کی بچی پر جسے انہوں نے مثل اولاد کے پالا ہے۔ پورے کرتی ہیں +

تمّت